آخری قسط

باب

غلام میراں

عدم ادراک سے ادرک تک کی داستان۔ ایک مجرم کی روداد جسے اس کے احساس ندامت نے مجرم نہ رہنے دیا۔کسی برگزیدہ ہستی کی نظرکا کرشمہ۔ایک بے وفا کی بے وفائی کا فسانہ۔

کسی کی بے لوث چاہت کی کہانی۔

ایک عظیم ذی روح کی عظمت کا احوال جوموت کی اذیت بھلا کر اخبار کے گردآلو ٹکڑے پر معاف لکھتا رہا۔

ایک بلند حوصلہ باپ کی بپتا جو اپنے بیٹے کی وصیت پر پابند رہا۔

سلاخوں کے پیچھے مقید قیدیوں کے لیے امید کی ایک کرن۔

آشقہ دلوں کے لیے بطور خاص آنسوؤں کی روشنائی سے لکھا جانے والا ناول۔

چچا مرزا کے یوں اس انداز سے کمرے سے چلے جانے پر میرے ابا خورشید عالم بھی اپنا ضبط قائم نہ رکھ سکے۔ وہ بڑے ابا کی باتیں سن کر بوکھلائے ہوئے لگ رہے تھے۔گویا انہیں لگتا تھا کہ چوہدری عبدالغنی کی بیٹی جوان کے بیٹے طہٰ کی محبت میں گرفتار چوری چھپے ان کے گھر آنے سے بھی نہ ڈرتی تھی وہ کسی صورت میں بھی اس رشتے سے انکار نہ کریں گے اوراب سبھی کچھ ان کی سوچ کے برعکس ہورہا تھا وہ اپنی نشست سے اٹھ کر بڑے ابا کے روبرو جا بیٹھے اور رنجیدہ خاطر ہوکر بولے۔

”ابا جی آپ چوہدری عبدالغنی سے دوبارہ اس سلسلے میں بات کریں یہ دو خاندانوں کا نہیں بچوں کی زندگیوں کا معاملہ ہے۔“ ابھی ابا نے اپنی بات مکمل ہی کی تھی جب بڑے ابا یوں غصے سے بھڑک اٹھے اور اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے آزردگی سے بولے۔

”بس کرو خورشید عالم اپنے بچوں کی غلطیاں سدھارنے کی بجائے انہیں غلطیاں کرنے سے روکو۔“ ایسا کہتے ہوئے بڑے ابا نے یوں خشمگیں نگاہوں سے میری جانب دیکھا کہ جن کی تاب نہ لاتے ہوئے میں مزید پل بھر بھی وہاں کمرے میں نہ ٹھہر سکا اور وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا تھا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر میری عجب حالت ہورہی تھی۔پچھلے کئی روز سے جس محبت کو پالینے کے میں سپنے بنتا رہا تھا۔وہ سپنے یوں پل بھر میں بکھر جائیں گے ایسا میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا اور اب میں راحت سے ملنے کے لیے بے تاب ہورہا تھا۔میں نے جھٹ سے اپنے موبائل سے اس کا نمبر ڈائل کیا بیل جاتی رہی لیکن اس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ایسا دیکھ کر میری اذیت مزید بڑھ رہی تھی میں بے کل سا ہوکر کمرے میں چکر کاٹنے لگتا اور کبھی آرام کرسی پر بیٹھ جاتا ابھی چند ساعتیں ہی مجھ پر گراں گزری تھیں کہ یکا یک میرے موبائل پر راحت کی کال آگئی۔ میں نے جھٹ سے فون اٹھا کر کال ریسیو کی تو وہ میرا حال دریافت کررہی تھی۔وہ آزردہ لگ رہی تھیں۔اس کی آواز سے لگ رہا تھا کہ وہ روتی رہی تھی اور مجھے یوں ظاہر کررہی تھیں جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا اور میرا بھی جو دل

مجروح ہوا تھا تو میں بھی کہاں تک اپنی حالت چھپاتا وہ مجھے ڈھارس بندھاتی رہی اور میں اسے تسلی دیتا رہا پھر وہ مجھے ستانے لگی کہ طٰہٰ میں اپنے ڈیڈی سے کہوں گی وہ جلد اپنے خاندان بھر کو راضی کرلیں گے۔ انہیں اس رشتے سے کوئی اعتراض نہیں ہوگا اس کی بات سن کر میں نے اس سے ملنے کے لیے درگاہ آنے کو کہا اور وہ آنے کے لیے راضی ہوگئی۔ اسی شام میں راحت سے ملنے درگاہ جا پہنچا۔ وہ میرے خاصا انتظار کرنے کے بعد وہاں پہنچی تھی وہ بے حد ڈری اور سہمی لگ رہی تھی۔ وہ میرے پاس پہنچتے ہی بتانے لگی کہ اب وہ مجھ سے یوں کھلم کھلا ملنے نہیں آسکے گی اور اس کی وجہ اس کے انکل تھے۔ اس کے ڈیڈی چوہدری عبدالغنی نے جب رشتے کی بابت اپنے بڑے بھائی سے بات کی تو وہ جیسے اپنے بھائی کی معصومیت پر عش عش کر اٹھے انہیں سمجھانے لگے کہ بھائی صاحب یہ آپ کیا کرنے جا رہے ہیں اپنے سیاسی رقیبوں کے ہاں ہی اپنی بیٹی بیاہنے چلے ہیں سوچیں اگر آپ خورشید عالم سے رشتہ جوڑ لیں گے تو آنے والا الیکشن آپ خورشید عالم کی ٹکر میں لڑسکیں گے؟ تب چوہدری عبدالغنی نے اپنے بڑے بھائی کی اس بات پر غور کیا اور پھر رشتے سے انکار کردیا اور اب اس کے انکل نے راحت پر پہرہ بھی بٹھا دیا تھا اتنا سب ہوجانے کے باوجود میں راحت کی باتیں سن کر حیران ہو رہا تھا وہ مجھے یقین دلا رہی تھی کہ سب اچھا ہوجائے گا اسے کچھ وقت لگے گا اور وہ اپنے ڈیڈی کو راضی کرلے گی وہ ایسا اس قدر یقین سے کہہ رہی تھی کہ مجھے بھی اس کی باتوں پر یقین آنے لگا تھا اس روز کے بعد ہم فون پر ہی باتیں کرنے لگے تھے جب انہی دنوں میرا ایف ایس سی کا رزلٹ آگیا۔ میں پاس ضرور ہوا تھا لیکن نمبر اتنے کم تے کہ پھر مجھے کسی اچھی یونیورسٹی میں ایڈمیشن نہ مل سکا لامحالہ بی اے میں ایڈمیشن لے کر ساتھ ہی میں ایک آرٹ اسکول سے اسلامک کیلی گرافی کا فن سیکھنے لگا یہ وہی دن تھے جب تک میں شراب، جوا اور ابا کی سیاست سے ابھی دور ہی تھا اور اس دوری کی وجہ ماں تھی جو ہر حال میں یہ چاہتی تھی کہ میں پہلے اپنی تعلیم مکمل کرلوں پھر سیاست تو گھر کی باندی تھی لیکن ابا کی سوچ اس سے بالکل برعکس تھی پہلے پہل وہ مصطفیٰ عالم کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے رہے لیکن ابا کی پے در پے سیاسی ناکامیوں کو دیکھ کر مصطفیٰ عالم کا دل خود ہی بھر گیا تو انہوں نے اپنی ساری توجہ تعلیم پر مرکوز کرلی اور اب باقی بچا تھا میں تو ایک روز جب میں آرٹ کی کلاس لے کر گھر پہنچا تو مجھے گھر کے دروازے پر ہی اپنے ابا مل گئے انہوں نے سر تا پاؤں ایک بار مجھے دیکھا اور پھر میرے کاندھے کو تھپتھپاتے ہوئے بولے۔

”بیٹا طٰہٰ یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے۔“ ابا کی بات سن کر میں نے اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے بڑے بڑے کینوس ایک طرف رکھے اور بولا۔

”بابا جی میں ایک آرٹ اسکول میں کیلی گرافی سیکھ رہا ہوں۔“ وہ میری بات سنتے ہی جھٹ سے بولے۔

”بیٹا اچھا شوق ہے لیکن اتنی محنت بھی کررہے ہو لیکن تمہیں یہ سیکھ کر ملے گا کیا؟“ ابا کی یہ بات سن کر میں انہیں کوئی جواب نہ دے سکا تو وہ میرے قریب کھڑے کچھ سوچتے ہوئے دوبارہ بولے۔

”چلو بیٹا ایسا کرو کہ تم الیکشن ہال میں آج میرے ساتھ چلو الیکشن قریب آرہا ہے اور بہت سے ایسے کام ہیں جو بیٹا میں تمہارے ذمہ لگانا چاہتا ہوں۔“ ایسا کہتے ہوئے وہ بہت سنجیدہ لگ رہے تھے ان کی بات سن کر میں سیدھا اپنے کمرے میں پہنچا اور تیار ہوکر جو

میں باہر آیا تو ابا باہر میرا ہی انتظار کر رہے تھے سکھ چین کے بڑے سے پھیلے ہوئے پیڑ کے نیچے ہی ابا کی کالی پجارو کھڑی تھی جس پر ابا کے انتخابی نشان والے اسٹیکر بھی لگے ہوئے تھے۔ میرے وہاں پہنچتے ہی نجانے کہاں سے ہوا کا ایک تیز بگولا آیا اور میرے سر پر سکھ چین کے سرسبز پتوں کی تالیوں کا شور گونجنے لگا۔ پھر میرے اور ابا کے گاڑی میں بیٹھتے ہی مائیکل نے گاڑی الیکشن کیمپ کی جانب بڑھا دی راستہ بھر ابا میرے اور راحت سے متعلق ہی باتیں کرتے رہے وہ اب یہ جان کر بے حد خوش تھے کہ راحت اور میں ابھی تک ایک دوسرے سے ملتے رہتے تھے۔

الیکشن آفس پہنچ کر گاڑی رکی تو ہمارے گاڑی سے اترتے ہی ابا سے ملنے آئے ان کے دوست احباب پر تپاک استقبال کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ وہاں بہت سے چہرے تو ایسے تھے جنہیں میں پہچانتا ہی تھا لیکن چند ایک چہرے میرے لیے نئے بھی تھے ان نئے چہروں میں بوبی اور ذیشان بھی تھے جنہوں نے اسی سال ابا کی پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی وہ میرے ہم عمر ہی لگ رہے تھے اور ایسے متحرک کارکن ابا کے بڑے کام کے آدمی ہوتے تھے۔ ابا مجھے کچھ دیر تک یونہی لوگوں سے ملواتے رہے سیاسی تبصرے چلتے رہے پھر انہوں نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا اور میں ان کے ہمراہ الیکشن کیمپ میں بنے ان کے آفس میں چلا آیا آفس میں داخل ہو کر ابا نے اپنی اونچی نشست والی کرسی پر خود بیٹھنے کے بجائے مجھے بٹھایا اور پھر میرے روبرو بیٹھتے ہوئے بولے۔

”طٰہٰ بیٹا تم اور راحت ایک دوسرے کو بے پناہ چاہتے ہو مجھے اس بات کا احساس ہے اور بیٹا تمہارے بڑے ابا کو بھی یہ بات پتا ہے لیکن تم جسے چاہتے ہو وہ کسی عام سے شخص کی بیٹی نہیں بلکہ وہ

وجہ

”میں آپ کی ملازمت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔“ گھر کے ملازم نے اپنے مالک سے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔

”مگر کیوں؟ کیوں جا رہے ہو؟“ مالک نے پوچھا۔

اس لیے کہ آپ کو مجھ پر اعتبار نہیں رہا“ نوکر بولا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ ”مالک بولا“ میرے گھر کی ساری چابیاں میز پر پڑی رہتی ہیں کیونکہ مجھے تم پر بھروسہ ہے۔“

”لیکن ان چابیوں میں سے ایک بھی تجوری میں نہیں لگتی۔“ ”نوکر جھلا کر بولا۔

ہمارے سب سے بڑے سیاسی حریف چوہدری عبدالغنی کی بیٹی ہے اور وہ کسی طور یہ نہیں چاہیں گے کہ وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ ہمیں تمہارے لیے دیں ان لوگوں نے تو بیٹا تمہارے بڑے ابا کی زبان کی لاج بھی نہیں رکھی تو پھر......!“

ابا بات ادھوری چھوڑ کر رک گئے جب میں نے ان کی اگلی بات کو جاننے کے لیے انہی کی بات کو دہرایا۔ تو پھر ابا۔“ میری بات سن کر جیسے وہ میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے سرعت سے بولے۔

”تو پھر اپنا حق چھین لو بیٹا۔“ ابا نے یہ بات اس قدر زور ڈالتے ہوئے کہی کہ مجھے لگا ان کی ایک بار کہی بات کئی بار میرے ذہن میں ٹکراتی رہی تھی ان کی کہی اس بات کی گونج ابھی کمرے میں باقی تھی جب وہ میرے سامنے سے اٹھے اور کمرے میں ایک جانب پڑے کیبنٹ میں چابی لگا کر وہ ایک بریف کیس نکال لائے بریف کیس کو میز پر رکھتے ہوئے کھول کر ابا نے میری جانب کر دیا۔ پانچ پانچ ہزار کے نوٹوں سے بریف کیس بھرا پڑا تھا۔ روپے پیسے کی ریل پیل تو گھر میں تھی ہی لیکن اتنا سارا پیسا آج میں

نے پہلی بار دیکھا تھا میری نگاہیں کبھی بریف کیس میں موجود پیسہ تولنے لگتیں تو کبھی میں سوالیہ نگاہوں سے ابا کو دیکھنے لگتا جب ابا میری اضطرابی کیفیت کو بھانپتے ہوئے بولے۔

"یہ سارا پیسہ تمہارے لیے ہے طٰہٰ جاؤ اپنے محبت کو اس شہر سے بہت دور لے جاؤ اور جب تک یہاں حالات ٹھیک نہ ہو جائیں تمہیں یہاں لوٹنے کی ضرورت نہیں۔" آخری بات کہتے ہوئے ابا نے میرے سامنے پڑے بریف کیس کو اپنے ہاتھوں سے بند کیا اور پھر اسے میری جانب سرکا دیا ایسا دیکھ کر ایکا ایکی میں اپنی نشست سے اٹھا آج مجھے ابا پر بے حد پیار آیا میں سرعت سے آگے بڑھ کر ان کے سینے سے جا لگ اور وہ مجھے دعائیں دیتے رہے پھر وہی سے میں مائیکل کو ساتھ لے کر بینک پہنچا جہاں میں نے وہ سارا پیسہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرایا اور واپسی پر مائیکل مجھے گھر چھوڑ کر گاڑی واپس الیکشن ہال میں لے گیا۔

روپیہ، پیسہ دولت چیز ہی ایسی ہے اگر یہ انسان کے پاس نہ ہو تو انسان اسے حاصل کرنے کی جہد میں بے قرار رہتا ہے اور اگر یہ بینک بیلنس یا تجوریوں میں بھرا پڑا ہو تو تب بھی یہ انسان کو بے قرار ہی رکھتا ہے۔ پچاس لاکھ روپے ابا نے مجھے سونپ دیے اور اب یہ سارا پیسہ اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرانے کے بعد میں آزاد تھا اب میں چاہے تو اس روپے پیسے سے کچھ بھی خرید سکتا تھا من چاہی زندگی گزار سکتا تھا شہر بھر کے وہ ریسٹورنٹ، کلب، بار، گالف، کیسینو اور ایسی تمام جگہیں جہاں جانے کے لیے وافر پیسہ درکار تھا اب وہ سبھی جگہیں میری دسترس میں تھیں۔ چند لمحوں، چند گھڑیوں پہلے میں کیا تھا اور اب ان لمحوں میں، میں کیا کچھ سوچ رہا تھا اک عجب اضطراری کیفیت تھی ایک عجب سرور تھا میں کچھ دیر لیٹ کر آرام کرنا چاہتا تھا اور

پھر رات میں آج جشن منانا چاہتا تھا لیکن بستر پر لیٹتے ہی میں آنکھیں بند کرتا تو پلکوں تلے سے نیند نجانے کہاں کھو گئی تھی دن بھر میں اب اس سے شام ڈھلے میں تھک ہار کر چند گھڑی آرام کر لیا کرتا تھا لیکن آج تھکن نام کی کوئی چیز ہی نہ محسوس ہو رہی تھی۔

راحت سے بات کیے بھی کافی دن بیت چکے تھے۔ اب میں اس سے دو ٹوک بات کرنا چاہتا تھا کہ اگر اس کے ڈیڈی نہیں مان رہے تو پھر ہم دونوں یہاں سے بھاگ چلیں گے کہیں دور جہاں کوئی ہم تک نہ پہنچ پائے جہاں اس کے اور میرے ابا کی سیاست ہمارے ملن کی راہ میں بیڑی نہ بنے جہاں ہم اپنا اک نیا جہاں بسائیں اور اب اسے یہ اپنے دل کی بات کہنے کے لیے میں نے اپنے فون سے اس کا نمبر ملایا نجانے اس گھڑی وہ بھی مجھ سے یہی بات کرنے کو بے تاب بیٹھی تھی اس نے پہلی بیل جانے پر ہی کال ریسیو کر لی۔

"طٰہٰ میں راحت۔" اس کی بھرائی ہوئی آواز سن کر میں مضطرب سا ہو کر بولا۔

"ہاں راحت میں نے تمہیں پہچان لیا کیا ہوا تمہیں۔" وہ میری بات سن کر خاموش رہی جب میں عجب اضطراری کیفیت میں اس کے جواب کا منتظر تھا وہ کچھ دیر خاموشی کے بعد دوبارہ بولی۔

"سب کچھ ختم ہو گیا طٰہٰ سب کچھ۔" اس کی بات سنتے ہی میرے پیروں تلے سے جیسے زمین کھسکنے لگی تھی۔

میں ابھی تک اس کی حالت کو سمجھ نہیں پایا تھا کہ وہ رقت آمیز لہجے میں بول رہی تھی زبان پر بات کرتے ہوئے رعشہ سا طاری تھا۔ اس نے ابھی تک کچھ نہیں بتایا تھا وہ فقط اتنا کہہ کر خاموش ہو گئی تھی کہ سب کچھ ختم ہو گیا طٰہٰ اور میں بھی دم سادھے کھڑا سوچ رہا تھا کہ بیتے چند روز میں ایسی کیا انہونی ہو گئی کہ جواب راحت

اس قدر آبدیدہ لگ رہی تھی دوسری جانب مکمل خاموشی پا کر میں فوراً بولا۔

"راحت کچھ تو بتاؤ خدارا بولو کہ ایسا کیا ہوگیا جو سب کچھ ختم ہوگیا۔" وہ میری یہ بات سنتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اب اس سے بات بھی ٹھیک سے نہیں ہو پا رہی تھی پھر چند گھڑیاں یونہی گزر گئیں اور جب وہ ذرا سنبھلی تو اس کی بات سن کر مجھے ذرا سنبھلنے کے لیے سہارے کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے اس کی منگنی ہونے جا رہی تھی اپنے ماموں زاد سے اور وہ چند روز میں دبئی سے پاکستان آ رہا تھا صرف اور صرف راحت سے منگنی کے لیے میں اس کی بات سن کر چلاتے ہوئے بولا۔

"ایسا نہیں ہوسکتا راحت تم تو کہتی تھیں تمہارے ڈیڈی مان جائیں گے پھر کیا ہوا۔" میری یہ بات سن کر وہ گھٹی گھٹی سی آواز میں بولی۔

"میں کچھ نہیں کرسکی طہٰ میں جو کچھ کرسکتی تھی میں نے کرلیا وہ نہیں مانے اور وہ ہرگز نہیں مانیں گے۔" اس کی بات ختم ہوتے ہی میں سرعت سے بولا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں راحت۔" اس نے میری بات سن کر ملنے کے لیے ہامی بھر لی وہ تو خود بھی مجھ سے ملنے کے لیے بے تاب تھی لیکن ساتھ ہی اپنی مجبوری بتاتے ہوئے اس نے فوراً ملنے سے انکار کردیا تھا راحت سے بات کرنے کے بعد میں خاصی دیر تک بے حس و حرکت اپنی جگہ پر ہی بیٹھا رہا اور سوچتا رہا کہ "میں اتنی آسانی سے سب کچھ ختم نہیں ہونے دوں گا چوہدری عبدالغنی میں راحت کو اپنے ساتھ لے جاؤں گا...... یہاں سے بہت دور......!" یونہی سوچتے ہوئے مجھے کمرے میں گھٹن اور گھبراہٹ کا احساس ہونے لگا تھا۔ میں اپنے کمرے سے نکلا اور منی پجارو لے کر ایگلشن آفس چلا آیا رات کے اس

آفر

ایک امریکی نے اپنے پڑوسی کو نشانے بازی کی مشق کرتے دیکھا تو اس کے پاس جا کر بولا "آپ کو بندوق احتیاط سے چلانی چاہیے۔ کل آپ کی چلائی ہوئی گولی میری بیوی کو لگتے لگتے رہ گئی۔"

"اوہ آئی ایم ویری سوری۔" امریکی بولا "برائے مہربانی مجھے معاف کردیجئے اور یہ لیجئے بندوق آپ اس کے بدلے میں میری بیوی پر ایک کی بجائے دو گولیاں چلا لیجئے۔"

پہلے پہر فقط بوبی اور ذیشان ہی وہاں میں موجود تھے وہ ٹیبل پر کوئی مار دھاڑ سے بھرپور فلم سے لطف اندوز ہو رہے تھے جب وہ مجھے وہاں دیکھ کر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے گویا انہیں اپنی بصارت پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔

وہ مجھے وہاں بیٹھنے کو کہتے رہے لیکن میں نے انہیں خود ہی اشارتاً کہیں اور چلنے کو کہا اور انہیں ساتھ لے کر میں ایک کیسینو بار چلا آیا یہ جگہ ہی ایسی تھی جہاں میں ان دونوں کے بغیر بغیر نہیں آسکتا تھا اور اس سے پہلے میں نے ہمیشہ اس جگہ کو دور دور سے ہی دیکھا تھا اندر داخل ہوئے بوبی اور ذیشان میرے دائیں بائیں یوں چل رہے تھے جیسے وہ میرے باڈی گارڈ ہوں اندر ہال جو روشنیوں سے جگمگا رہا تھا اس کی سیڑھیاں اترتے ہوئے یکایک میں آخری سیڑھی سے نیچے قدم رکھتے ہوئے اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکا جب عین اسی لمحے میں نے سامنے کھڑی لڑکی کے عقبی جانب سے ایک ہاتھ بڑھا کر اس کے کاندھے کا سہارا لیا اور میں گرتے گرتے سنبھل گیا وہ دراز قد ریشم واطلس کی ساٹن پہنے کاندھوں پر دراز گیسو بکھیرے چونک کر پلٹی اور اس کے ہاتھ میں صراحی نما جام چھلکا تو اس کی خشمگیں نگاہیں جو مجھ پر پڑیں اور اس کے لب بھی ہلے لیکن وہ کچھ بول نہ

سکی۔ تبھی اس کے عقب سے ایک جسیم نوجوان نمودار ہوا اور وہ اس کے لباس پر گری بیئر کو اپنے رومال سے صاف کرتے ہوئے مخاطب ہوا۔

"عبیرہ کس نے کیا یہ سب" اور یہ کہتے ہوئے اس کی نگاہ دو قدم پرے ہی جو میں کھڑا تھا مجھ پر پڑی اور جیسے وہ سب کچھ سمجھ گیا وہ غصے سے اپنے ابھرے ہوئے سینے کو مزید پھلاتا ہوا میری جانب بڑھا یہ دیکھتے ہی بوبی اور ذیشان بھی میرے عقب سے نکل کر سامنے آ گئے لیکن میں یہ دیکھ کر ششدر کھڑا رہ گیا جب عبیرہ نے اسے مجھ تک پہنچنے سے پہلے ہی روک لیا۔

"داؤد غلطی ان کی نہیں میری تھی جو میں بیچ راستے میں کھڑی تھی۔" عبیرہ کی بات سنتے ہی اس کا بڑھا ہوا قدم وہیں رک گیا لیکن وہ اپنے چہرے پر چھائے نفرت اور غصے کے تاثرات کو فوری دبا نہ سکا۔

"چلو چھوڑو داؤد۔" ایسا کہتے ہوئے عبیرہ اس نوجوان کا ایک بازو تھامے اسے ہم سے دور لے گئی۔ نہیں تو بوبی اور ذیشان اسے چھوڑنے والے کہاں تھے وہ تو میرے ہاتھ کا اشارہ پاتے ہی رک گئے تھے ورنہ اب تک داؤد بار کے شیشے کی طرح جگمگاتے فرش پر ڈھیر پڑا ملتا۔ میں نے اب اپنی نگاہ کو چارسو گھمایا جو چند ایک لوگ اپنی مصروفیت چھوڑ کر ہماری جانب متوجہ ہوئے تھے وہ پھر سے پینے پلانے اور لٹانے میں لگ چکے تھے اور اب میں بھی بوبی اور ذیشان کے ساتھ اپنے قدم بار کے کاؤنٹر کی جانب بڑھا چکا تھا۔ اونچی سٹول نما کرسیوں پر ذرا اچھل کر بیٹھتے ہی بوبی نے بیئر کا آرڈر دے دیا اور پھر پہلا ہی جام میری جانب بڑھایا جو میں نے اس کے ہاتھ سے لے کر کاؤنٹر پر ٹکائی اپنی کہنیوں کے درمیان رکھ لیا اور اب میں اس پر جھکا نہ جانے کن اداسیوں میں گم تھا جب اچانک میں نے اپنا سر دائیں جانب گھما کر دیکھا اور پھر چند لمحوں تک میری نگاہ وہیں ٹھہر گئی۔ وہی ریشم واطلس کی ساٹن پہنے عبیرہ داؤد کے ساتھ بیٹھی نجانے کب سے ٹکٹکی باندھے میری جانب ہی دیکھے جا رہی تھی اور وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ میں بھی اب اسے ایسا کرتے دیکھ چکا تھا میں نے عبیرہ کو ذہن سے جھٹکتے ہوئے اپنی کہنیوں کے بیچ رکھے جام کو اٹھایا اور آنکھیں زور سے بند کرتے ہوئے سارا جام ایک ہی سانس میں پی لیا اور جب دوبارہ سے آنکھ کھلی تو میرے گردونواح کا منظر ہی بدل چکا تھا لیکن درحقیقت منظر وہی تھا میں ہی اپنی سدھ بدھ کھو کر عالم مدہوشی میں جا اترا تھا کچھ عجیب بے سوادہ سا چہرہ بناتے ہوئے میں آنکھوں کو تیزی سے جھپکاتا اپنا دماغ ٹھکانے پر لانے کی سعی کر رہا تھا جب بوبی نے میرا خالی جام پھر سے بھر دیا اور میں نے بھی جو کہ پہلے ہی جام پر ڈگمگا گیا تھا کمال جرأت سے دوسرا بھی اٹھایا اور اپنے خشک ہوتے حلق میں اتار لیا۔ ایسا کرتے ہی ایک عجب سی لہر میرے وجود میں اٹھی اور میں جھنجنا سا گیا اور شبد میرے لبوں پر خود ہی مچلنے لگے دل کی حالت زبان سے خود بہ خود عیاں ہونے لگی۔

"کچھ ختم نہیں ہوا...... راحت، میں نہیں ہونے دوں گا ایسا۔" میں نے ایک دم سے اپنا بھاری ہوتا سر اٹھایا۔ بوبی اور ذیشان نے اپنے جام میرے ہاتھ میں دبے جام سے یوں ٹکرایا کہ پھر چھن چھنا کی جو آواز ابھری تو ساتھ ہی دونوں نے اپنا اپنا جام لبوں سے لگا لیا۔ لیکن اب کی بار میں ایسا نہ کر سکا مجھے جام میں راحت دکھائی دے رہی تھی بے بس لاچار مجبور سی اور پکار رہی تھی۔

"میں جو کر سکتی تھی میں نے کر لیا اب کچھ نہیں ہو سکتا طٰہ سب کچھ ختم ہو گیا۔" راحت کی بات سن کر میں چلانے لگا اور چیختے ہوئے اسے یہ احساس دلا رہا تھا کہ میں کچھ نہیں ہونے دوں گا نشے نے بری طرح

سے میری سدھ بدھ چھین لی تھی اور اسی حالت میں بوبی اور ذیشان مجھے گاڑی تک لے گئے میں جو ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا تو دیر تک گاڑی کو چابی ہی نہ لگا سکا ایسا دیکھتے ہوئے ذیشان نے چابی میرے ہاتھ سے لی اور میں خود ہی ڈرائیونگ سیٹ سے ہٹ کر ساتھ والی سیٹ پر جا بیٹھا اب ذیشان گاڑی نکال کر واپس الیکشن ہال کی جانب لے جارہا تھا جب راستے میں ایک جگہ پہنچ کر میں نے شور مچاتے ہوئے ذیشان کو گاڑی روکنے کو کہا اور اس نے بھی میرے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے فوراً ہی گاڑی روک دی۔ گاڑی کے رکتے ہی میں آناً فاناً گاڑی سے نکلا اور اسٹریٹ لائٹ کی مدھم سی روشنی میں ڈگمگاتے قدموں کے ساتھ شاہراہ کے قریب ہی بنگلوں کی جو لمبی قطار شروع ہوچکی تھی اس میں سے چوہدری عبدالغنی کے بنگلے کی طرف بڑھنے لگا۔ میرے عقب میں بوبی اور ذیشان سمجھ ہی نہیں پائے کہ میں کیا کرنے جارہا ہوں وہ تاحال گاڑی میں ہی موجود تھے اور میں اب اس بنگلے کے بیرونی آہنی گیٹ تک پہنچ چکا تھا گیٹ کی آہنی سلاخوں کو اپنے دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھامے اب میں باآواز بلند چلا رہا تھا۔

”دروازہ کھولو راحت میں تمہیں لے جانے آیا ہوں۔“ رات کی تاریکی اور سناٹے میں آہنی دروازے سے پیدا ہونے والا شور اور میری بلند آواز دور دور تک سنی جاسکتی تھیں۔ چند ہی لمحوں میں بنگلے کی سبھی بتیاں آن ہوگئیں لیکن چوکیدار نے دروازہ نہیں کھولا بنگلے کی بتیاں جل اٹھتے ہی میرے عقب سے بوبی اور ذیشان بھی دوڑتے ہوئے مجھ تک پہنچ چکے تھے وہ مجھے زبردستی واپس گاڑی میں لے جانا چاہتے تھے لیکن میں انہیں بھی یہی کہے جارہا تھا کہ میں راحت کو لے کر ہی جاؤں گا اس دوران ہوائی فائرنگ کی آواز سنائی دی بوبی

آپ کو معلوم ہے؟

o پنجاب یونیورسٹی پاکستان کی سب سے پرانی یونیورسٹی ہے۔

o ریڈیو پاکستان کے مونوگرام پر ایک آیت لکھی ہوئی ہے جس کا مطلب ہے لوگوں سے خوش اخلاقی سے پیش آؤ۔

o کانگریس کی بنیاد 1885ء میں پڑی تھی۔

o دنیا کا سب سے کم آبادی والا ملک کویت ہے۔

o کیمبرلی (جنوبی افریقہ) جہاں ہیروں کی کان موجود ہے۔

o سانپ اڑسکتا ہے یہ بات بالکل غلط ہے البتہ کچھ سانپ ایسے ہوتے ہیں جو ہوا میں دور تک چھلانگ لگا سکتے ہیں۔

o پتلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کیا کسی کو راستہ سمجھایا جاسکتا ہے؟ ہزار میں ایک شخص بھی ایسا نہیں کرسکتا۔ ہر شخص ہاتھ کے اشارے سے ہی دوسرے کو راستہ سمجھاتا ہے۔ حالانکہ ہاتھ سے اشارہ کرنا بالکل بھی ضروری نہیں ہے۔

نے مجھے کھینچ کر نیچے بٹھا لیا چند لمحے تو فائرنگ کی آواز سنائی دیتی رہی اور جب گنیں خاموش ہوئیں تو بوبی اور ذیشان بڑی مشکل سے مجھے گاڑی تک لے کر پہنچے اور گاڑی میں بیٹھتے ہی بوبی نے گاڑی سرعت سے الیکشن کیمپ کی جانب بڑھا دی۔ راستہ بھر میں انہیں ٹوٹے پھوٹے لفظوں میں پھر سے گاڑی روکنے کو کہتا رہا لیکن بوبی نے گاڑی الیکشن کیمپ پہنچا کر ہی دم لیا گاڑی رکتے ہی دونوں نے مجھے کاندھے کا سہارا دیا اور پھر اندر لے جاکر بستر پر لٹا دیا کمرے کے بستر پر لگتے ہی پھر میں دھیرے دھیرے نیند کی وادی میں جا اترا۔

اگلے روز جب میری آنکھ کھلی تو سب سے پہلے

مجھے ماں کا چہرہ دکھائی دیا وہ مجھ پر جھکی میرے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر رہی تھیں۔ وہ بے حد مضطرب دکھائی دے رہی تھیں اور میں جانتا تھا کہ اس کی وجہ میں ہی تھا وہ میرے آنکھ کھلتے ہی بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔

"میرا بیٹا رات بھر نشہ کر کے الیکشن کیمپ میں پڑا سوتا رہے گا تو کیا ماں کو علم نہیں ہوگا طحہ" ماں کی بات سن کر میں نے ان کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی لیکن انہوں نے ہاتھ پیچھے کر لیا رات کے نشے کا اثر ابھی تک میری بوجھل آنکھوں تلے باقی تھا جب آنکھیں ملتے ہوئے مجھے وہ لفظ بھی نہ مل رہے تھے جن لفظوں سے میں ماں کے غم کی تلافی کر پاتا یکا یک ماں کے عقب سے ابا نمودار ہوئے کمرے کا دروازہ کھلتے ہی باہر سے آنے والے شور سے پتا چلتا تھا کہ باہر کوئی بڑی تقریب ہونے جا رہی تھی۔ ابا نے کمرے میں داخل ہو کر ایک نظر ماں کی جانب دیکھا اور پھر میرے ذرا پاس آ کر سرعت سے بولے۔

"طہٰ بیٹا تمہارے پاس پندرہ بیس منٹ ہیں جلدی سے اٹھ جاؤ آج تقریب میں تمہیں بھی تقریر کرنی ہے بس تمہیں ان کو یقین دلانا ہے کہ ان کی بات سنی جائے گی اہل علاقہ کے سبھی مسائل حل ہوں گے غریب طبقہ کو مراعات دی جائیں گی باقی تم سمجھتے ہو بیٹا اسکول سے لے کر اب یونیورسٹی تک ہر تقریری مقابلہ تو تم جیتتے ہی آئے ہو بس آج ذرا بھلے بھلے ہو جانی چاہیے۔" ایسا کہتے ہوئے وہ ذرا گردن گھما کر ماں سے متوجہ ہوئے۔

"بیگم آپ یہاں کیا کر رہی ہیں آپ کو تو باہر ہونا چاہیے اٹھیے جائیے باہر ممبر خواتین کشور، سلطانہ بھی پہنچ چکی ہیں وہ آپ سے ملنے کے لیے منتظر ہیں۔" ایسا کہتے ہوئے وہ ایک بار پھر سے مجھے اشارتاً اٹھنے کا کہہ کر ماں کو ساتھ لے کر باہر نکل گئے ان کے جاتے ہی لامحالا مجھے بھی اٹھنا ہی پڑا اور یہ میں جانتا تھا کہ اگر میں فوری طور پر نہ اٹھا تو کچھ ہی دیر میں اسپیکر پر میرا ہی نام پکارا جا رہا ہوگا اور تبھی ابا مجھے وہاں نہ پا کر کمرے میں آئیں گے اور پھر مجھے اس حالت میں ان کے ساتھ چلنا ہوگا۔

پھر میں جو سوچ ہی رہا تھا تو تھوڑی ہی دیر میں ابا دوبارہ کمرے میں چلے آئے یہ تو اچھا ہوا کہ تب تک میں تازہ دم ہو چکا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور میرے ذرا پاس ہو کر وہ میرے کوٹ کا کالر درست کرتے ہوئے مجھے تقریر میں کہے جانے والے اہم نکات سمجھنے لگے ساتھ ہی وہ اپنی کلائی پر بندھی گھڑی پر وقت بھی دیکھتے جا رہے تھے یونہی باتیں کرتے ہوئے ان کا اشارہ پا کر اب میرے قدم باہر کی جانب اٹھ چکے تھے جب کمرے سے باہر قدم رکھتے ہی سورج کی تیز کرنوں کا سامنا کرتے ہوئے جیسے میری آنکھیں چندھیا گئی تھیں میں نے کوٹ کی جیب سے لٹک رہے سن گلاسز کو چہرے پر سجایا اور اب الیکشن کیمپ سے نکلتے ہوئے ہم اس گراؤنڈ کی جانب بڑھ رہے تھے جہاں ابا نے جلسہ منعقد کر رکھا تھا گراؤنڈ کے عقبی جانب سے ہم اسٹیج پر پہنچے تو سامنے سیلاب کی مانند انسانوں کا انبوہ دکھائی دے رہا تھا ابا کے ساتھ میرے اسٹیج پر قدم رکھتے ہی کسی نے میرا نام پکارا اور پھر فضا تالیوں کے شور سے گونج اٹھی اسٹیج پر بیٹھے سبھی مہمانان خصوصی کو میں نے اشارتاً سلام کیا اور پھر میں مائیک کی جانب بڑھ گیا اور اب میرے اندر سے ایک سیاسی لیڈر کا بیٹا بول رہا تھا۔ وہی اہل علاقہ کی خیر خواہی کا جذبہ دن رات ان کی خدمت میں رہنے کا وعدہ چھوٹے بڑے سبھی مسائل حل کرنے کی یقین دہانی، غربت دور کرنے کے خواب غربا کے لیے مختلف

وظائف اور پھر چار سو گونجتا تالیوں کا شور اور اسی شور کے تھمنے تک میں ابا سے اجازت لے کر ماں کے ہمراہ گھر چلا آیا تھا گھر پہنچ کر ماں مجھ پر واری جا رہی تھی وہ میرے اوپر سے صدقہ بلائیں اتارتی، پیسہ وارتی ملازموں میں بانٹتی رہی جب ایک دم سے مجھے راحت کا خیال ستانے لگا اور میں وہاں سے سیدھا اپنے کمرے میں چلا آیا کمرے میں پہنچ کر میں نے فوراً اس کا نمبر ڈائل کیا لیکن اس کا نمبر بند ملا پھر دوسری، تیسری، چوتھی بار بھی میری کوشش کرنے پر اس کا نمبر مسلسل بند جا رہا تھا اور میرا دل تھا کہ جیسے ڈوبا جا رہا تھا رات نشے میں، میں اس کے گھر سے باہر کھڑا نہ جانے کیا کچھ بولتا رہا تھا اور یہ تو اچھا ہوا جو بوبی اور ذیشان میرے ساتھ تھے جو وہ مجھے فوراً وہاں سے اٹھا کر ایگزیکشن ہال چلے آئے تھے نہیں تو شاید میں اسپتال میں زندگی اور موت کی آخری سانسیں گن رہا ہوتا یا سلاخوں کے پیچھے اپنی رہائی کا انتظار کر رہا ہوتا پھر رہ رہ کر میرے ذہن میں یہی خیال آ رہا کہ کہیں میرے ایسا کرنے کی وجہ سے ہی تو اب اس کا فون بند نہیں جا رہا میرے ذہن میں اٹھتے اس سوال کا جواب مجھے وہی دے سکتی تھی۔

اسی شام وہ خوش قسمت لمحہ مجھے مل ہی گیا جب میرے کال کرنے پر اس کا نمبر کھلا تھا اور پھر اس نے فوراً ہی کال ریسیو کر لی لیکن دوسری جانب مکمل خاموشی تھی پھر یہ خاموشی مجھ سے زیادہ دیر تک برداشت نہ ہو سکی اور یہ جانتے ہوئے کہ وہ دوسری جانب فون کان سے لگائے میری آواز سن رہی ہے میں باآواز بلند اس سے مخاطب تھا۔

”راحت تم بس ایک بار ہاں بولو میں تمہیں سات پہروں سے بھی نکال لاؤں گا۔ بولو راحت تم خاموش کیوں ہو بولتی کیوں نہیں تم تو کسی سے ڈرتی نہ تھیں یہ سماج، دنیا رسم و رواج پہرے تم انہیں کہاں مانتی تھیں پھر تمہاری خاموشی کی وجہ کیا ہے کیوں آج تمہارے لب سل گئے ہیں کیوں آج تم اس قدر مجبور لگ رہی ہو کس بات کا خوف ہے تمہیں میں آج بھی تمہارے ساتھ ہوں راحت میں کل بھی تمہارے ساتھ تھا اور ہمیشہ رہوں گا۔“ میں ہی بولتا رہا جب وہ ابھی تک خاموش تھی اور پھر میں نے بھی خاموشی اختیار کر لی ایک لمحے بعد ہی اس کی ہچکیوں میں ڈوبی آواز ابھری۔

”طٰہٰ آج منان دبئی سے لوٹ آیا ہے آج شب میری منگنی ہونے جا رہی ہے۔“ اس کی فقط اتنی سی بات سن کر میں بے تاب ہو کر بولا۔

”راحت تم گھر سے چلی آؤ ہم دونوں یہاں سے کہیں بہت دور چلے جائیں گے جہاں ہمیں کوئی تلاش نہ کر سکے جہاں کوئی ہم تک نہ پہنچ سکے۔“ میں ابھی بول ہی رہا تھا جب وہ میری آخری بات مکمل ہوتے ہی بولی۔

”تم ہی یہ کہتے ہو طٰہٰ کہ میں کسی سے نہیں ڈرتی، یہ سماج، دنیا رسم و رواج پہرے تم صحیح کہتے ہو طٰہٰ میں اب بھی نہیں ڈرتی میں اس وقت بھی نہیں ڈری تھی جب تمہارے گھر والے سارے گھر میں مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے کیوں، جانتے ہو اس لیے طٰہٰ کے میرے ڈیڈی مجھ پر اعتماد کرتے تھے میں روز شام انہیں ضرور بتایا کرتی ہوں کہ میں آج کس سے ملی کیوں ملی اور مجھے اگر کسی سے ملنے جانا ہے تو کیوں جانا ہے۔ تب انہیں میری ہر خوشی عزیز تھی تو آج جب خاندان والے ان کی بات نہیں سن رہے تو کیا میں اپنے ڈیڈی پر اپنی ایک خوشی قربان نہیں کر سکتی طٰہٰ۔“

”تم پاگل ہو چکی ہو راحت تمہیں علم ہے جسے تم ایک خوشی کہہ رہی ہو وہی تمہارے جیون بھر کی خوشی ہے کیا میں ہی تمہاری وہ پہلی اور آخری چاہت نہیں؟“

نجانے کیوں اس کی باتیں سن کر میں یوں دیوانہ سا ہو کر اب بولے جا رہا تھا

وہ میری آخری بات سن کر خاموش تھی اور میں بھی اس کے سامنے ایک سوال رکھ کر خاموش ہو چکا تھا۔ جبکہ دھڑکنیں بے قابو ہو کر کسی سنسان ویران مندر کی گھنٹی کی طرح بج رہی تھیں گویا میرے اندر کا مجازی خدا کسی کو اپنے قدموں تلے جھکانا چاہتا تھا پرستش مانگ رہا تھا سجدے کی خواہش تو نہ تھی لیکن بلیدان چاہتا تھا عزت کا، آبرو کا اور پھر اس نے بلیدان دے ہی دیا اپنی محبت کا جیون بھر کی خوشیوں کا اس نے مجھ سے کہا۔

"طٰہ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی اور میں یہ بھی نہ کہوں گی کہ تم بھی مجھے بھول جانا تم اپنی کلائی پر بندھی میری فرینڈ شپ بینڈ کبھی مت اتارنا یہ میری کلائی پر بھی بندھی ہے آدھی تمہارے پاس آدھی میرے پاس لیکن ہمیں جینا ہے طٰہ تمہیں میرے لیے اور مجھے اپنے ڈیڈی کی خوشیوں کے لیے تم ایسا کرو گے ناطٰہ تم سے فقط پہلی بار تو کچھ مانگ رہی ہوں مجھے یہ اعتماد دو گے ناطٰہ۔ بولو طٰہ خاموش کیوں ہو؟" نجانے کیوں میں اسے جواب نہ دے پایا اور میں نے فون بند کر دیا۔

اسی رات میں تنہا بار جا پہنچا اور جب میں وہاں بیٹھا کئی جام اپنے حلق سے اتار چکا تھا تو ایک اور جام اٹھاتے ہی اسے کسی نے میرے ہاتھ سے چھین لیا میں نے یوں نفرت اور حقارت سے اپنے سر کو اٹھا کر دیکھا تو سامنے عبیرہ کھڑی تھی میں نے اسے دیکھتے ہی یوں دیوانوں کے سے انداز میں اس کے گرد و نواح میں دیکھا۔

"آج وہ نہیں آیا آپ کو وہ بالکل اچھا نہیں لگا تھا نا مجھے بھی وہ بالکل اچھا نہیں لگتا۔" وہ میرے چار سو دیکھنے پر سرعت سے بولی اور میرے قریب رکھی میز پر بیٹھتے ہی اس نے اپنے دراز کھلے بالوں کو جھٹک کر اپنے چہرے سے ہٹایا اور اب اپنی بڑی بڑی نگاہوں میں نجانے وہ مجھ سے کیا کیا سوال پوچھتی رہی میں بھی کب خاموش رہا بولتا چلا گیا وہ راحت ہے ناں؟ اوہوں اوہوں اوہوں ہاہاہاہا وہ بڑی بے وفا نکلی۔ پتا ہے...... تم کو...... مجھے کہتی ہے تمہیں میرے لیے جینا ہے...... اور آگے پتا ہے کیا کہتی...... ہیں مجھے اپنے ڈیڈی کے لیے جینا ہے...... بے وفا نکلی...... تم کو بھی اپنے ڈیڈی کے لیے جینا ہے یا وہ جو تمہارا بوائے فرینڈ ہے کیا نام ہے اس کا...... ہاں...... ہاں داؤد تمہیں داؤد کے لیے جینا ہے۔" میں نشے میں نجانے اسے کیا کیا بولتا رہا اور وہ میری اتالیق بنی میرا پاٹ سنتی رہی نہ اس نے مجھے ٹوکا نہ بید اٹھا کر مجھے مارنے کو دوڑی بس کسی ذہین وفطین شاگرد کی طرح وہ مجھے سنتی رہی اور جب میں اپنی سدھ بدھ کھونے کو تھا وہ مجھے اٹھائے سہارا دیے اپنی گاڑی پر اپنے گھر لے گئی۔

اگلے روز جو میری آنکھ کھلی تو اپنے گرد و نواح کا جائزہ لینے پر مجھے احساس ہوا کہ میں اپنے گھر اپنے بستر پر نہیں تھا پھر جو ذرا ذہن پر زور ڈالا تو گزری رات کسی بھولے بسرے خواب کی طرح میرے ذہن کے سلولائیڈ پر کالی پرچھائیوں کی طرح دکھائی دینے لگی اور مجھے یاد آیا کہ رات میں اپنے گھر جانے کے بجائے عبیرہ کے ساتھ اس کے گھر چلا آیا تھا ایسا یاد آتے ہی میں نے فوراً وقت دیکھا ساڑھے گیارہ بج رہے تھے اب میں یہاں مزید رکنا نہیں چاہتا تھا میں نے ارد گرد نظر دوڑائی سائیڈ ٹیبل پر میرا پرس اور موبائل رکھے تھے لیکن گاڑی کی چابی نہ تھی میں نے دونوں چیزیں اٹھائیں اور کمرے سے باہر نکل گیا کمرے سے نکل کر راہداری میں سے گزر کر اب میں ہال میں داخل ہو رہا تھا اور اب تک مجھے اس کی حیثیت کا اندازہ

ہو چکا تھا۔ میں چند لمحے ہال میں کھڑا کسی کی آمد کا انتظار کرتا رہا جب میری نظر ہال میں ایک دیوار پر نصب اسلامک کیلی گرافی کے فن پارے پر پڑی میں بے ساختہ اس کی جانب بڑھ گیا ایک بہت بڑے کینوس پر سورۃ الرحمان کی چند آیات کو بے پناہ خوب صورت سے رنگوں کے حسین امتزاج کے ساتھ یوں لکھا گیا تھا کہ پڑھنے والے کی زبان سے بے ساختہ یہ کلمات ادا ہو جاتے تھے اور تم اللہ کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے۔'' لیکن پھر میں ان آیات کا سامنا دیر تک نہ کر سکا اور میں وہاں سے پلٹا۔ جب ہال کے بیرونی دروازے سے ایک شخص اندر داخل ہوا اور مجھ پر نگاہ پڑتے ہی وہ میری جانب چلا آیا اور قریب پہنچتے ہی مسکرا کر سلام کرتے ہوئے بولا۔

''صاحب آپ اٹھ گئے میں آپ کی گاڑی لینے چلا گیا تھا یہ چابی لے لیں۔'' اس سے چابی لیتے ہوئے میں نے عبیرہ سے متعلق دریافت کیا تو وہ بتانے لگا کہ بی بی صاحب باہر دھوپ میں بیٹھی ہے یہ سنتے ہی میں ہال کے بیرونی دروازے کی جانب بڑھا ابھی میں ہال کے دروازے سے باہر پہنچا ہی تھا کہ پھر وہی ملازم میرے عقب سے مجھ کو پکارتا میرے قریب آ پہنچا۔

''صاحب بی بی صاحبہ نے بولا تھا جب آپ اٹھ جائیں آپ کو ناشتہ کرا دوں۔'' ملازم کی بات سن کر میں نے اسے ناشتہ لانے سے منع کر دیا اگرچہ بھوک تو تھی لیکن اب میں یہاں سے جلد سے جلد نکلنا چاہتا تھا ملازم میری بات سن کر الٹے پیروں لوٹ گیا اور میں ہال کی بیرونی سیڑھیاں اترتا ذرا آگے بڑھا تو سردیوں کی ٹھنڈی میٹھی دھوپ میں لان میں لگی کرسیوں پر ہی مجھ کو عبیرہ بیٹھی دکھائی دی اور اب میں دھیرے دھیرے لان کی نرم ملائم گھاس پر چلتا اس تک جا پہنچا وہ اپنے پیروں کو میز پر ٹکائے کرسی کی پشت گاہ سے اپنا سر لگائے آنکھیں موندھے لیٹی ہوئی تھی میں نے اسے جگانا مناسب نہ سمجھا اور اس کے سامنے ہی رکھی ایک دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے میں جیسے ہی میز پر رکھے اخبار کو اٹھانے کے لیے جھکا وہ اخبار کے کاغذ کی سرسراہٹ پا کر جاگ گئی اور مجھ پر نظر پڑتے ہی اس نے جھٹ سے میز پر رکھے پیر نیچے کر لیے اور سرعت سے بولی۔

''آپ اٹھ گئے طٰہٰ۔'' اس کی بات سن کر میں مسکرا کر بولا۔

''شکریہ عبیرہ اگر رات میں ویسی ہی حالت میں اپنے گھر جانے کی کوشش کرتا تو شاید نہ پہنچ پاتا۔''

''شکریہ کی ضرورت نہیں طٰہٰ پر ہاں اگر ایک کام بولوں تو کریں گے۔'' میری بات کا جواب دیتے ہوئے اس نے جو ایک کام کرنے کی بات کہی تو میں نے جھٹ سے اثبات میں سر ہلا دیا یوں میرا جواب پا کر وہ مجھ کو عجب سی نگاہوں سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''اگر ہو سکے تو کبھی مجھے راحت سے ملوا دیں گے۔'' اس کی بات سنتے ہی میں ایک جھٹکے سے اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا؟

''آپ راحت کو کیسے جانتی ہیں۔'' میں نے حیرت سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے کہا اور وہ بھی مجھے یوں ششدر حیران کھڑا دیکھ کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''رات نشے میں آپ راحت کو ہی تو پکارتے رہے تھے میں ایک بار اس لڑکی سے مل کر اس سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ وہ ایسی کیا مجبور تھی کہ اس نے آپ جیسے شخص کو چھوڑ دیا۔'' عبیرہ کی بات سن کر میں سوچنے لگا کہ اب شاید میں خود بھی اس کی جھلک نہ دیکھ پاؤں تو پھر بھلا تمہیں کیسے ملوا سکوں گا لیکن ذہن میں آئی یہ بات میں نے فقط اپنے تک ہی رکھی اور

اسے کہا کہ اگر ممکن ہو سکا تو میں اس کی یہ خواہش ضرور پوری کروں گا۔" ایسا کہتے ہوئے میں نے اس سے اجازت چاہی وہ مجھے ناشتہ کے لیے روکتی رہی لیکن میں نے معذرت کرلی اب اپنی گاڑی میں بیٹھنے سے پہلے میں نے ایک نظر دوڑا کر اس کے وسیع رقبے پر پھیلے خوب صورت گھر کو دیکھا اور پھر میں تعریف کیے بغیر نہ رہ سکا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی اسے اسٹارٹ کر کے آخری بار میں نے ہاتھ ہلا کر اسے الوداع کہا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

عبیرہ کے گھر سے نکل کر میں سیدھا اپنے گھر نہیں جانا چاہتا تھا میں جلد سے جلد ابا سے ملنا چاہتا تھا اور میں جانتا تھا کہ اس وقت ابا کہاں ملیں گے الیکشن قریب ہونے کی وجہ سے ابا اب اپنا زیادہ وقت الیکشن ہال میں ہی گزارتے تھے یہی سوچ کر میں نے گاڑی گھر کی بجائے الیکشن ہال کی جانب بڑھادی۔ الیکشن کیمپ وہاں سے زیادہ دور تھا آدھے پونے گھنٹے میں ہی میں وہاں جا پہنچا۔ گاڑی سے اترتے ہی میں سیدھا ابا کے آفس کی جانب بڑھا جب آفس سے باہر پہنچ کر مجھے الیکشن ہال میں کام کرنے والے ایک ملازم نے روکا۔

"صاحب بڑے صاحب نے کسی کو اندر آنے سے منع کر رکھا ہے۔" اس کی بات پر مجھے سخت غصہ آیا لیکن میں جلدی میں تھا سنی ان سنی کر کے میں دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور جونہی میں اندر پہنچا میرے پیر وہیں جم گئے سامنے ہمارے ملک کی ایک مایہ ناز اداکارہ بیٹھی تھیں اس کے ہاتھ میں سگار تھا جسے دیکھ کر یوں لگ رہا تھا کہ میرے کمرے میں داخل ہونے سے ایک لمحہ پہلے ہی اسے ابا نے اپنے ہاتھ سے اس کے ہاتھ میں تھمایا تھا وہ سگار خاص میرے ابا ہی پیتے تھے اس نے ریشم واطلس کی بنی ساڑھی زیب تن کر رکھی تھی جس پر لگے ستاروں کی جھلمل سے کمرہ جگمگایا ہوا تھا اور اسی جھلمل جھلمل روشنی میں مجھے کوئی بات یاد آگئی تھی جب میں نے یونیورسٹی میں داخلہ لیا تھا تو اکثر میرے کلاس فیلو یہ جان کر کہ میں مشہور سیاست دان خورشید عالم کا بیٹا ہوں مجھ سے میرے ابو اور اداکارہ عذرا جہاں سے متعلق پوچھا کرتے تھے اور میں ان کی یہ باتیں سن کر بھڑک جایا کرتا تھا اور آج ان باتوں کی تصدیق بھی ہوگئی تھی اور اب میری نظر عذرا جہاں کے سراپا سے اس وقت ہٹی جب ابا نے مجھے پکارا۔

"برخوردار کیسے آنا ہوا۔ آؤ میں تمہیں ان سے ملواؤں۔" ابا کی بات مکمل ہوتے ہی میں سرعت سے بولا۔

"ابا مجھے آپ سے علیحدگی میں بات کرنا ہے۔" ایسا کہتے ہوئے میں کمرے سے نکلنے کے لیے پلٹا جب میرے عقب سے مجھے ابا کی آواز سنائی دی وہ میرا روکھا رویہ دیکھ کر عذرا جہاں سے معذرت کر رہے تھے ایسا سن کر میں نے تیزی سے دروازہ کھولا اور جب میں نے اپنے قدم کمرے سے باہر رکھے تو دروازہ زور سے بند ہوگیا۔ میں کچھ دیر تک وہیں کھڑا کچھ سوچتا رہا اور پھر آفس سے ملحقہ کمرے میں جا پہنچا آفس سے ملحقہ کمرے میں ابا کا انتظار کرتے ہوئے چند لمحوں تک ابا کے آفس کا کمرہ ہی میرے ذہن میں گردش کرتا رہا عذرا جہاں کی ریشمی ساڑھی کی جھلمل اس کے ہاتھ میں موجود سگار اور پھر ابا کا مجھے چونک کر دیکھتے ہوئے یہ کہنا کہ برخوردار کیسے آنا ہوا آؤ میں تمہیں ان سے ملواؤں اور آخر میں کمرے کا زور سے بند ہوتا دروازہ لیکن اب جو زور سے دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو یہ ابا تھے وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھ پر برس پڑے۔

"تمہیں مہمانوں کے ساتھ پیش آنے کی ذرا تمیز نہیں اور کیا ہوا ہے تمہیں، ایسی کیا بات ہوگئی جو تم وہاں نہیں کرنا چاہتے تھے۔" ان کی سرزنش بھری گفتگو سن کر میں اپنا غصہ دبا کر خاموش رہا تو وہ پھر غصے سے چلائے۔

"طحہ میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں دیکھو بیٹا میں بہت مصروف ہوں جو تمہیں کہنا ہے کہہ چکو اب۔" ابا کی بات سن کر اب کی بار میں خاموش نہ رہ سکا اور بولا۔

"ابا...... رات راحت کی منگنی ہوگئی ہے۔"

"کیا...... چوہدری عبدالغنی نے اپنی بیٹی کی منگنی کردی کہاں کی، میرا مطلب ہے کون سا خاندان ہے؟" ابا نے حیران، ششدر ہو کر مجھ سے دریافت کیا تو میں انہیں بتانے لگا۔

"ابا وہ اس کا رشتے میں ماموں زاد ہے اور رات ہی وہ دبئی سے لوٹا ہے۔" ابا میری بات سن کر جھٹ سے بولے۔

"تمہیں فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے طٰہٰ بیٹا تم اور راحت تو ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہو نا پھر اگر چوہدری عبدالغنی نے زبردستی بے چاری راحت بیٹی کی منگنی کر ہی دی ہے تو کیا ہوا تم اسے تسلی دو اگر اس کا باپ ضد پر اڑ ہی گیا ہے تو اسے......!"

"ابا وہ میرے ساتھ نہیں آ رہی اسے اپنے خاندان کی عزت اپنی محبت سے زیادہ عزیز ہے۔ اس نے میرے ساتھ چلنے سے انکار کردیا ہے۔" ابا کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میں نے سرعت سے ساری حقیقت بیان کردی اور ابا میری بات سن کر ٹھٹک گئے ان کے متغیر ہوتے رنگ سے لگتا تھا جیسے وہ جیتی بازی ہار چکے تھے۔ چند لمحے خاموشی کے بعد وہ صوفے پر جا بیٹھے اور بدستور سوچتے ہوئے انہوں نے مجھے بھی اپنے قریب صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں اشارہ پاتے ہی ان کے نزدیک بالکل پاس ہو کر جا بیٹھا وہ اپنے سر کو میرے ذرا اور نزدیک لاتے ہوئے رازدارانہ انداز میں بولنے لگے۔

"جن لوگوں نے تم سے تمہاری محبت چھین لی طٰہٰ تم ان لوگوں سے ان کی عزت چھین لو تا کہ بدنام کردو انہیں کسی کو اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں اور جوان کی عزت کو اپنی عزت بنانے چلے ہیں وہ لوگ بھی ان کے منہ پر تھوک کر چلے جائیں پھر یہ تمہارے اختیار میں ہوگا طٰہٰ کہ تم چاہو تو راحت کو اپنا لو یا چاہو تو تم بھی......!"

"بس ابا میں سب سمجھ گیا۔" ابا کی باتیں سن کر میرے سینے میں سلگ رہی آگ جیسے اچانک بھڑک اٹھی تھی یکایک میں اپنی نشست سے اٹھ کھڑا ہوا ابا کے دلائے اشتعال سے میرے وجود سے چنگاریاں اٹھ رہی تھیں۔

"ابا کل کا دن جب طلوع ہوگا تو آپ چوہدری عبدالغنی کا زوال دیکھیں گے۔" میرے ایسے جذبات سن کر میرے عقب سے ابا نے میرے کاندھے کو تھپتھپایا اور میں سینے میں بدلے کی آگ لیے اپنے مقصد کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے چل پڑا الیکشن سیکریٹ سے میں نے بوبی اور ذیشان کو ساتھ لیا اور ایک خاص پرنٹنگ پریس جہاں سے ابا کے الیکشن کی مہم کے دوران لگائے جانے والے بینر اور فلیکس بھی تیار ہوتے تھے وہاں جا پہنچا وہیں میں نے اپنی اور راحت کی ایک تصویر اور چند عشقیہ کلمات دے کر پریس والوں کو ہدایت کی کہ چند گھنٹوں میں ہی مجھے اس کی ہزاروں کاپیاں پوسٹر کی صورت میں چاہئیں۔ پرنٹنگ پریس والوں کو اس سے کیا غرض تھی کہ اس طرح کے پوسٹر شائع کرنے سے کسی کی بیٹی کی عزت کی دھجیاں اڑتی تھیں کسی کا گھر بسنے سے پہلے ہی تباہ

ہو جانا تھا، مجھے یہ پوسٹر اپنے انتقام کے لیے درکار تھے۔ انہیں تو غرض تھی پیسے سے، انہیں کسی کے نفع نقصان کی کیا پرواتھی انہیں تو فقط اپنے نفع کی فکر تھی۔

جب کمپیوٹر میں کمپوزنگ ہو رہی تھی پازیٹیو بن رہے تھے فریم سیٹ ہو رہے تھے اور پھر مشینیں چلنا شروع ہوگئیں۔ میں ذیشان اور بوبی کو سبھی کچھ سمجھا چکا تھا۔

عبیرہ کے گھر سے نکل کر میں سیدھا الیکشن سیکریٹریٹ پہنچا تھا وہیں سے پھر میں ابا سے مل کر بوبی اور ذیشان کو ساتھ لے کر پرنٹنگ پریس چلا آیا تھا اور جب پریس والوں نے ہمیں ہزاروں کی تعداد میں پوسٹر پرنٹ دیے تو ہمیں رات ہو چکی تھی لیکن اپنے پلان کے مطابق ہم نے یہ پوسٹر آدھی رات کے بعد دیواروں پر نصب کرنے تھے اور اس مقصد کے لیے میں ذیشان اور بوبی کے ساتھ خود بھی جانے والا تھا۔ ابھی کافی وقت پڑا تھا اور میں تھک بھی چکا تھا۔

بس یہی وجہ تھی کہ میں نے بوبی اور ذیشان کو الیکشن سیکرٹریٹ اتارا، پوسٹر میں نے وہاں چھوڑ کر جانا مناسب نہ سمجھا یوں بوبی اور ذیشان کو رات دیر کو تیار رہنے کا کہہ میں، پوسٹر گاڑی میں ساتھ لیے گھر چلا آیا۔

گھر پہنچ کر گاڑی پورچ میں کھڑی کر کے جب میں تیزی سے اپنے کمرے کی جانب بڑھ رہا تھا مجھے بڑے ابا مل گئے وہ جلدی میں لگ رہے تھے، وہیں کھڑے کھڑے ان سے ذرا سی علیک سلیک ہوئی اور پھر وہ باہر کی طرف چلے گئے اور میں اپنے کمرے میں چلا آیا کمرے میں پہنچتے ہی تھکاوٹ سے بوجھل اپنے وجود کو میں نے بستر سے لگایا تو کچھ سکون ملا اور دھیرے دھیرے میری آنکھیں بند ہونے لگیں اور جب میرے فون پر سیٹ الارم بجا تو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اگرچہ اس وقت ابھی مجھے مزید آرام چاہیے تھا میری آنکھیں نیند کے بوجھ تلے مشکل سے کھل پا رہی تھیں لیکن پھر چوہدری عبدالغنی کا خیال ذہن میں آتے ہی بدلے کی آگ پھر سے دہک اٹھی۔

''چوہدری عبدالغنی کل کا سورج جب طلوع ہوگا تو پھر وہ تمہارے زوال کا آغاز ہوگا۔'' بستر سے اٹھتے ہوئے میں خود سے ہی بڑبڑایا اور پھر آدھی رات کو گھر سے نکلتے ہوئے حتی الامکان میری یہی کوشش تھی کہ گھر کے کسی بھی فرد کو میرے آدھی رات میں یوں باہر جانے کی خبر نہ ہو۔ اسی مقصد سے میں نے گاڑی اسٹارٹ کرنے کے بعد اس کی اگلی پچھلی بتیاں بھی آن نہ کی تھیں۔ یوں دھیرے سے میں گاڑی لے کر گھر سے نکلا اور پھر گاڑی کو تیزی سے الیکشن سیکرٹریٹ کی جانب بڑھا دیا وہاں پہنچا تو بوبی اور ذیشان پہلے سے ہی میرا انتظار کر رہے تھے انہیں ساتھ لے کر میں چلا تو ابھی کچھ فاصلہ ہی طے ہوا تھا کہ جب مجھے یوں احساس گزرا کہ جیسے کوئی ہمارا پیچھا کر رہا ہو، لیکن پھر میرے عقب میں آرہی گاڑی جب سرعت سے میرے قریب سے گزر گئی تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھ کر ذہن سے جھٹک دیا اور ساتھ ہی گاڑی کی ریس بڑھا کر میں نے گاڑی بائیں جانب موڑ دی۔ یہ وہی اسٹریٹ تھی جہاں راحت کا ماموں زاد منان رہائش پذیر تھا اور میں یہ سب کچھ پہلے سے معلوم کر چکا تھا اب ہمارا مقصد یہی تھا کہ ہم منان کے محلے سے پوسٹر لگانے کا آغاز کریں گے اور پھر یونہی آگے بڑھتے ہوئے سارے علاقے میں لگا دیں گے۔

پھر ایک جگہ پہنچ کر میں نے گاڑی روک دی یہاں اب اسٹریٹ بالکل سنسان پڑی تھی۔ میں نے بوبی اور ذیشان کو نیچے اترنے کا اشارہ کیا وہ دونوں میرا اشارہ پاتے ہی نیچے اترے، تب تک میں بھی گاڑی بند کرنے کے بعد نیچے اتر چکا تھا۔ میں نے ایک بار

اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا گھروں سے باہر لگے برقی قمقمے جل رہے تھے جن کی مدہم روشنی میں آدھے چاند کی روشنی بھی گھل مل رہی تھی۔ آسمان بالکل صاف شفاف دکھائی دے رہا تھا جگمگاتے ستاروں کی بارات سجی تھی اور مجھے ایسا ہی موسم درکار تھا میرے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لینے کے دوران بوبی گاڑی میں سے پوسٹر نکال کر اب میرے اشارے کا منتظر کھڑا تھا اور ذیشان کے ہاتھ سے گلیو تھا جس سے پوسٹر دیوار پر چپکانے تھے میرا اشارہ پاتے ہی ذیشان بوبی کے ہاتھ میں موجود پوسٹر پر گلیو لگانے لگا اور پھر ایسا کرنے کے بعد بوبی نے دو، چار قدم کے فاصلے پر ہی دیوار پر پہلے پوسٹر کو چپکا دیا وہ پہلا پوسٹر دیوار سے چپکا کر پلٹا تو دوسرا پوسٹر میرے ہاتھ میں تھا اور ذیشان اسے گلیو لگا رہا تھا ہم تینوں ہی دائرے میں کھڑے تھے جب یکا یک بوبی کے عقب سے آہٹ پا کر ہم تینوں نے مڑ کر دیکھا اور پھر جیسے میرے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی۔ ابھی چند لمحوں پہلے بوبی جو پوسٹر دیوار سے چپکا کر پلٹا تھا بڑے ابا وہی پوسٹر دیوار سے اکھاڑ کر ہاتھ میں تھامے ہماری جانب چلے آرہے تھے نزدیک پہنچ کر بڑے ابا نے ہاتھ میں پکڑے پوسٹر کے کئی ٹکڑے کرتے ہوئے انہیں میری جانب اچھال دیا کچھ ٹکڑے سیدھے میرے چہرے سے ٹکرائے اور کچھ اڑتے ٹکڑوں کے بیچ میں انہیں نفرت اور شدید غصے میں بولتے ہوئے سن رہا تھا۔

''تم اس قدر اوچھی، غلیظ حرکتوں پر اتر آئے ہو طہٰ، یہ دن بھی مجھے دیکھنا تھا۔ جب میری اولاد اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے چہروں پر سیاہی ملنے جارہی ہے۔'' اتنا کہہ کر وہ میرے قریب ڈرے سہمے سے کھڑے ذیشان اور بوبی کی جانب بڑھے بوبی کے ہاتھ سے پوسٹر اور ذیشان کے ہاتھ سے گلیو کی بوتل چھین کر انہوں نے دونوں ہی چیزیں یوں کھینچ کر میرے پیروں میں پٹخ دیں کہ میں ڈر کے تھوڑا پیچھے ہٹ گیا اب وہ پھر سے شدید غصے میں بول رہے تھے ''یہ غلیظ پوسٹر تو میں نے گھر میں کھڑی تمہاری گاڑی میں ہی دیکھ لیے تھے اور پھر انہیں پڑھتے ہی میں گاڑی سمیت ہی آگ لگا دیتا لیکن پھر میں تمہارا سارا پلان سمجھنا چاہتا تھا تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑنا چاہتا تھا اور آج تم نے میرا سر شرم سے جھکا دیا طہٰ تم نے اپنی غیرت کا کیا اچھا سودا کیا۔''

آخری کلمات ادا کرتے ہوئے وہ میری گاڑی کی جانب بڑھے اور اگلے ہی پل گاڑی میں رکھے پوسٹر انہوں نے باہر پھینکنے شروع کر دیے۔ ایسا دیکھ کر مجھ میں جرأت نہ ہوئی کہ میں آگے بڑھ کر بڑے ابا کو روک سکوں اور مجھے یوں بے بس دیکھ کر بوبی اور ذیشان بھی اپنی جگہوں پر بے حس و حرکت کھڑے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے اتنے میں بڑے ابا نے گاڑی میں لگا پوسٹرز کا ڈھیر باہر گرا لیا تھا پھر وہ اس ڈھیر کے پاس کھڑے اسے آگ لگا رہے تھے اور پھر چند ہی لمحوں میں ہمارے سامنے پڑے سیکڑوں پوسٹر آگ کا الاؤ بن گئے جس الاؤ کی روشنی میں بوبی، ذیشان اور میں بڑے ابا کے سامنے مجرم بنے کھڑے تھے۔

اس واقعہ کو لے کر اگلے کئی روز تک بھی بڑے ابا کی نفرت اور غصے میں کمی واقع نہ ہوئی اور وہ کئی ہفتوں مجھ سے خفا رہے انہی دنوں جب میں نے بھی اپنے آپ کو اپنے کمرے کی حد تک محدود کر رکھا تھا۔ ایک روز میرے موبائل پر راحت کی کال آئی کئی بیل ہو چکی تھیں اور میں حیرت سے اس کے نام کو اپنے موبائل کی اسکرین پر دیکھ رہا تھا جیسے مجھ کو یقین ہی نہ آرہا تھا کہ راحت اب بھی مجھ سے رابطہ کر سکتی تھی۔ پھر میرے کال ریسیو کرتے ہی وہ جھٹ سے بولی۔

''طہٰ تم نے تو پلٹ کر ایک بار بھی میرا حال نہ

پوچھا۔ جھوٹے منہ ہی سہی ایک مبارک باد کا پیغام تک نہ بھیجا اپنے مختصر سے ساتھ کا واسطہ دے کر ایک تم سے اعتماد ہی تو مانگا تھا چلو طہٰ تمہاری مرضی چاہو تو جو مرضی سزا دے لو لیکن ایک بار پھر سے تم سے کچھ کہنے آئی ہوں، میں جا رہی ہوں اس شہر کو ہی نہیں اس دیس کو بھی چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ منان کی چھٹیاں بہت کم تھیں بڑوں نے یہی فیصلہ کیا کہ سادگی سے نکاح ہو جائے اور میں منان کے ساتھ ہی دبئی چلی جاؤں......بس اس دیس سے جاتے ہوئے یہی خواہش ہے کہ جب کل اس دیس کی فضاؤں سے اڑوں تو تم سے ایک ملاقات ہو جائے پھر میں تمہیں منان سے بھی ملواؤں گی وہ تمہیں بہت اچھے لگیں گے۔ آؤ گے ناطہٰ کل ائر پورٹ پر مجھے اور منان کو تمہارا انتظار رہے گا۔" وہ اپنی بات کہہ چکی اور نہ جانے کیسے میں نے بھی بھیگتی آنکھوں اور بھرائی ہوئی آواز میں اسے ہاں کہہ دی۔ وہ فون بند کر چکی تھی اور میں بڑے ابا کو دعائیں دے رہا تھا جن کی بدولت نا صرف راحت کی عزت بچ گئی تھی بلکہ میں راحت کی نظروں سے گرنے سے بھی بچ گیا تھا اگلے ہی روز میں عبیرہ کو ساتھ لیے ائر پورٹ جا پہنچا۔ عبیرہ سے بھی میں نے ایک بار عہد کیا تھا کہ میں اسے راحت سے ضرور ملواؤں گا اور اب وہ راحت سے مل کر بے حد خوش دکھائی دے رہی تھی اور منان سے ہوئی چند لمحوں کی ملاقات سے لگتا ہی نہ تھا کہ ہم اس سے پہلی بار مل رہے ہیں، میں راحت سے عبیرہ کا تعارف کرا رہا تھا جب مجھے یوں لگا جیسے میرے عقب سے کوئی مجھے پکار رہا تھا۔

"طہٰ...... طہٰ آر یو اوکے۔" میں خیالوں کے دائرے سے پلٹا یومنہ مجھ سے مخاطب تھی اور میرے گرد و نواح کا منظر یکسر بدل چکا تھا میرے دائیں بائیں کھڑے تانیا اور آیان مجھ سے کہہ رہے تھے۔

"پپا چلیے ناں......!" میں اس وقت جہاز کی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہیں کہیں خیالوں میں بہت دور نکل چکا تھا میں نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے تانیا اور آیان کے ہاتھ پکڑے اور سیڑھیاں اترتے ہوئے گردن گھما کر کہا۔

"یس...... آئی ایم فائن یومنہ۔" وہ میری بات سن کر یوں مسکائی جیسے صدیوں سے کسی اپنے بچھڑے سے مل کر مسکراتے ہیں۔

ائر پورٹ سے اپنا سامان وصول کر کے پھر جو ہم باہر پہنچے تو وہاں کوئی بھی ہمیں خوش آمدید کہنے کو موجود نہ تھا برسوں پہلے ابا نے مجھے گھر سے نکال دیا تھا اور اب میرا ان سے کوئی رابطہ نہ تھا۔ میں اس وقت مجبور تھا اور بہت پہلے جب ابھی میرا یومنہ سے نکاح بھی نہ ہوا تھا میں یومنہ کو صاف لفظوں میں بتا چکا تھا کہ اب جس راہ کا میں مسافر ہوں اس راہ پر چلتے ہوئے اگر تم میری ساتھی بننا چاہتی ہو تو ایک بار اپنے فیصلے پر غور کر لو میری راہ میں قدم قدم پر امتحان ہوں گے ہر قدم پر ایک نئی آزمائش کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے اور اس وقت اس نے کس اعتماد کے ساتھ جواب دیا تھا۔

"طہٰ آپ میرے ساتھ ہوں تو میں زندگی کی ہر آزمائش سے لڑ سکتی ہوں۔" اور آج اس نے اپنی کہی بات کو سچ ثابت کر دکھایا تھا وہ ہماری زندگی میں آئی ہر آزمائش پر ثابت قدم رہی تھی ٹھکرایا تو فقط مجھے میرے گھر والوں نے ہی تھا۔ چچا مرزا تو بہت اصرار کرتے رہے کہ میں ان کے پاس چلا آؤں لیکن یومنہ میری سوچ کو سمجھ چکی تھی وہ جانتی تھی کہ میں ایسا ہرگز نہ چاہوں گا کہ سسرال میں جا ڈیرہ لگاؤں تبھی اس نے بھی میرے ہر فیصلے پر سر تسلیم خم کیا تھا۔

ایئر پورٹ سے نکل کر میں نے ایک ٹیکسی والے سے کرایہ طے کیا تو پھر ہمارے بیٹھتے ہی اس نے

گاڑی محلہ مومن پورہ کی جانب بڑھا دی محلہ مومن پورہ وہی جگہ تھی جہاں میں برسوں پہلے آ کر رہائش پذیر ہوا تھا ایک پانچ مرلے کا مکان تھا جسے میں نے کرائے پر حاصل کیا تھا اور پھر جو اپنائیت، محبت اور پیار ہمیں اس محلے سے ملا پھر کہیں اور جا بسنے کا خیال ذہن میں آیا ہی نہیں اپنے شہر کو چھوڑ کر میلوں کی مسافت طے کرنے کے بعد میں محلہ مومن پورہ میں کوئی یونہی نہیں چلا آیا تھا بلکہ یہ تو جمیل میرے دوست کی مہربانی تھی جو اس نے مجھ بے یارومددگار کو یہاں لا بسایا تھا اور پھر صبر، امتحان، آزمائش کے بادل جب دھیرے دھیرے چھٹے تو مجھ پر میرے رب سوہنے کا ایسا فضل کرم ہوا تھا کہ اس نے مجھے اتنا عطا کیا کہ تب میں چاہتا تو محلہ مومن پورہ کو خیرآباد کہہ کر کسی پوش علاقے میں جا بستا لیکن یہ اہل محلہ کی ہی بے پناہ محبت تھی کہ میرے ذہن میں میں کبھی ایسا خیال بھی نہ گزرا جمیل کے ساتھ میرا فون پر رابطہ رہتا تھا اور وہ جانتا تھا کہ آج میں واپس لوٹ رہا ہوں۔

ڈیڑھ دو گھنٹے کے سفر کے بعد جب ڈرائیور نے گاڑی محلہ مومن پورہ میں واقع میری رہائشگاہ کے سامنے روکی تو اہل محلہ ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور پتیاں لیے ہمارے استقبال کے لیے کھڑے تھے میں جیسے ہی گاڑی سے نکلا تو جمیل کے بچوں اور علیم بابا کے پوتے پوتیوں نے ہم پر پھولوں کی برسات کر دی سبھی نے یوں گرمجوشی سے ہمارا استقبال کیا کہ سارے سفر کی تھکان گھر کے دروازے پر ہی دور ہوگئی۔ میرے اور یومنہ سے تو وہ اب عرصہ دراز کے بعد مل رہے تھے لیکن میری بیٹی تانیا اور بیٹے آیان سے وہ پہلی بار مل رہے تھے اور اس وقت سبھی کی توجہ کا مرکز وہی دونوں بنے ہوئے تھے جمیل کے پاس میرے گھر کی چابیاں موجود تھیں یہی وجہ تھی کہ میری آمد کا سن کر اس نے

ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی ایک بار سارے گھر کی صفائی ستھرائی کرادی تھی۔ گھر کے بیرونی دروازے کے دونوں پاٹ کھلے تھے اور جب میری نظر پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی پر پڑی تو مجھے خیال آیا کہ میں نے تو ابھی ڈرائیور کو کرایہ کے پیسے بھی نہ دیے تھے میں جو یہ خیال آتے ہی پلٹا تو معلوم پڑا کہ جمیل ٹیکسی والے کو کرایہ ادا کر چکا تھا اور جب ہم سبھی سے مل رہے تھے وہ ہمارا سامان بھی اندر پہنچا چکا تھا وہیں کھڑے کھڑے میں نے یومنہ کو اشارہ کیا کہ وہ محلہ کی عورتوں اور بچوں کو گھر لے آئے وہ میرا اشارہ سمجھ گئی تو میں نے اپنے دوست جمیل اور بابا علیم کو ساتھ لیا اور گھر داخل ہوتے ہوئے میں نے ان کا شکریہ ادا کیا کہ جس طرح سے ہر قدم پر ان لوگوں نے میرا ساتھ نبھایا یوں میرا کوئی اپنا بھی نہ کر سکتا تھا اب سبھی ہال میں بیٹھ چکے تھے جب میں نے یومنہ کو اشارے سے ایک طرف بلایا اور اس سے رائے لی کہ کیوں نہ ہم اپنے اور بچوں کے لیے لائے لباس اور کھلونے اہل محلہ میں تقسیم کردیں وہ میری یہ بات سن کر مسکرائی اور بولی۔

"طہ کبھی ہمارے پاس کچھ بھی تو نہ تھا اور اگر آج ہمیں اللہ تعالیٰ نے بھی نعمتوں سے نوازا ہے تو ہمیں بھی اپنے اردگرد بستے لوگوں کو بھولنا نہیں چاہیے۔" مجھے اس سے ایسے ہی جواب کی توقع تھی پھر ایک بیگ یومنہ عورتوں اور بچوں کی طرف لے گئی اور ایک بیگ کھول کر میں نے اپنے دوست جمیل اور بابا علیم کے سامنے بھی چیزیں رکھ دیں تاکہ وہ اپنی من پسند چیزیں اٹھالیں اسی دوران میں نے جو سر گھما کر یومنہ کی جانب دیکھا تو ہمارے دونوں بچے تانیا اور آیان بھی اپنے لیے لائی چاکلیٹ اور کینڈیز اپنے ہم عمر ساتھیوں میں تقسیم کر رہے تھے پھر یہ سلسلہ رات گئے تک چلتا رہا۔

اگلے روز صبح فجر کی نماز ادا کر کے ہم لوگ پھر

ذرا استراحت کو لیٹ گئے تھے اور پھر جو سو کر اٹھے تو بچے شہر دیکھنے اور گھومنے پھرنے کی فرمائش کرنے لگے تھے یہ دیکھ کر یومنہ مجھ سے کہنے لگی کہ گھر کے لیے سودا سلف بھی لانا ہے تو یوں بچوں کی سیر بھی ہو جائے گی یومنہ کی بات سن کر میں نے عرصہ دراز کے بعد پورچ میں کھڑی گاڑی کے اوپر سے کپڑا ہٹایا تو وہ میرے خیال کے عین مطابق اسٹارٹ نہیں ہوئی تھی۔ ایسا دیکھ کر میں قریبی ورکشاپ سے جا کر ایک مکینک کو ساتھ گھر لے آیا تھا اس نے اپنے ساتھ لائی بیٹری سے گاڑی اسٹارٹ تو کر دی تھی لیکن پھر وہ میرے کہنے پر گاڑی اپنے ساتھ ورکشاپ لے گیا تھا کیونکہ عرصہ دراز سے بند کھڑی رہنے کی وجہ سے چند ایک کام مزید باقی تھے جو کہ احسن طریقے سے ورکشاپ میں ہی جا کر کیے جا سکتے تھے یوں اس روز ہمیں گاڑی شام کو جا کر واپس ملی اور ہم لوگ بچوں کو ساتھ لے کر مغرب کے بعد گھر سے نکلے تھے پہلے تو ہم لوگ یونہی شہر کی چند ایک اہم شاہراہوں پر گھومتے پھرتے رہے پھر میں نے گاڑی ایک شاپنگ مال کی پارکنگ میں روکی جہاں سے خریداری بھی ہو سکتی تھی۔ کھانا بھی کھایا جا سکتا تھا اور بچوں کے لیے جوائے لینڈ بھی موجود تھا خریداری کے لیے ہمیں جوائے لینڈ کے قریب سے گزرتے ہوئے اگلی عمارت تک جانا تھا لیکن پھر بچوں نے ہمیں آگے کہاں بڑھنے دیا تھا لامحالہ ہم بچوں کو لیے جوائے لینڈ میں داخل ہو گئے۔ تانیا سات، آٹھ سال کی ہو رہی تھی جبکہ آیان ابھی پانچ سال کا ہی تھا یہی وجہ تھی کہ بہت سے جھولے ایسے تھے جن پر ابھی انہیں بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ تو ہم ان جھولوں کے نزدیک کھڑے ہی محظوظ ہوتے رہے پھر تانیا ہمیں گیم سیکشن میں لے جانے کے لیے اصرار کرنے لگی وہ سعودی عرب میں بھی ہمارے ساتھ جب جایا کرتی تھی تو پھر بہت سی کینڈیز اور کھلونے جیت کر ساتھ لے جایا کرتی تھی اور اب گیم جوائے لینڈ کی طرف بڑھتے ہوئے میں اسی لیے یومنہ کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا کیونکہ ہم دونوں ہی جانتے تھے کہ اب تانیا کے گیم مشین میں داخل ہونے پر کمپنی کا بہت نقصان ہونے والا تھا تانیا، آیان کا ہاتھ پکڑ کر ہم دونوں کے اندر داخل ہونے سے پہلے ہی اندر پہنچ چکی تھی ہم لوگ اندر پہنچے تو دونوں ہی مختلف گیمز کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ ہم لوگ ویک اینڈ پر نہیں آئے تھے یہی وجہ تھی کہ زیادہ بھیڑ بھاڑ نہ تھی۔ میں تانیا کے گیمز کا مشاہدہ کرنے تک کوئنز لے کر اس کے پاس جا کھڑا ہوا وہ دونوں کھلونے جیتنے والے گیم کے پاس کھڑے تھے اور تانیا آیان سے پوچھ رہی تھی کہ اسے کون سا کھلونا زیادہ پسند ہے آیان اسے ہاتھ کے اشارے سے یہ سب بتا رہا تھا تانیا نے اس کے گال پر پیار کیا اور اب اسے کھیلنے کے لیے کوئن چاہیے تھا وہ کوئن لینے کے لیے پلٹی میں اس کے عقب میں ہی کھڑا مسکرا رہا تھا میں نے اسے کوئن دیا اور اب یومنہ بھی میری جانب دیکھ کر مسکرا رہی تھی تانیا نے میرے ہاتھ سے کوئن لے کر گیم میں انٹر کیا اور پھر وہ اس کے کنٹرول ہینڈل ہاتھ میں لیے گیم کا آغاز کا انتظار کرنے لگی اگلے ہی پل گیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ وہ تیسری قطار میں ہی بہت پیارا سا ٹیڈی بیئر تھا جو آیان کو پسند آیا تھا چند سیکنڈ میں ہی کھلونوں کے پاس سے گزرتی راڈ کے دھکے سے اس ٹیڈی بیئر کو گرانا تھا ہم لوگ ابھی دم سادھے کھڑے ہی تھے جب تانیا نے اسے گرا لیا تھا وہ خوشی سے خود ہی تالیاں بجاتی آیان کو پیار کرنے کو جھکی تو تب تک گیم کے پاس کھڑے ملازم نے ان کا جیتا گفٹ ٹیڈی بیئر انہیں گیم کے عقب سے نکال کر دے دیا تھا اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے گیم کے اندر موجود سارے کھلونے ہمارے

ہاتھوں میں موجود تھے میں اور یومنہ ایک دوسرے کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کینڈیز والی گیم کی طرف بڑھے کیونکہ اب تانیا اور آیان وہاں پہنچ چکے تھے جب میں نے سر گھما کر دیکھا تو وہاں موجود ملازم بھی ابھی تک حیرت سے ایک دوسرے کا منہ دیکھ رہے تھے پھر ہماری طرح وہ بھی تانیا اور آیان کے ارد گرد تجسس سے کھڑے دیکھنے لگے کہ یہ چھوٹی سی بچی کینڈیز کا کیا حشر کرتی ہے اور پھر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اس بار ساری کی ساری کینڈیز بھی گیم سے باہر آ گری تھیں یہ دیکھ کر وہاں کھڑے ملازم حیران ششدر ہو کر کبھی ہمارے بچوں تانیا اور آیان تو کبھی ہمارے ہاتھوں میں موجود کھلونوں کو دیکھتے رہے۔ جوائے لینڈ میں آئے تو ہم لوگ خالی ہاتھ تھے لیکن اب دو بڑے بڑے بیگز میں کھلونے اور کینڈیز لے جا رہے تھے جوائے لینڈ سے نکل کر میں یومنہ اور بچوں کو ایک جگہ رکنے کا کہہ کر خود پارکنگ میں کھڑی گاڑی تک آیا اور پھر کھلونے اور کینڈیز گاڑی میں چھوڑ کر واپس یومنہ اور بچوں کے پاس چلا آیا جو میرا انتظار کر رہے تھے۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ہم لوگ آگے بڑھے تو ہمارے ارد گرد دائیں بائیں اب مختلف برینڈز کی دکانیں تھیں جن کے سامنے سے ہم لوگ گزر رہے تھے یونہی چہل قدمی کرتے ہوئے آگے بڑھتے ہوئے تانیا ایک جوتوں والی دکان کے سامنے پہنچ کر رک گئی وہ یومنہ سے جوتا لینے کی فرمائش کر رہی تھی۔ تانیا کو جوتا دلانے کے لیے ہم لوگ اس دکان میں داخل ہو گئے اندر پہنچ کر اندازہ ہوا کہ دکان کافی بڑی تھی جہاں بچوں بڑوں سبھی کے لیے ہر قسم کے جوتے دستیاب تھے لیکن ہماری بیٹی کو تو ساری دکان گھوم کر بھی کوئی جوتا پسند نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ ایک ریک کے پاس پہنچ کر رک گئی۔

”مما مجھے وہ جوتا چاہیے۔“ ابھی تانیا نے جوتا پسند ہی کیا تھا اور ایسا وہ اپنی مما کو بتا ہی رہی تھی جب ریک کے پاس ہی کھڑے سیلز مین نے ایک سرخ رنگ کے جوتے کو ریک سے اتار کر تانیا کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

”آپ کی بیٹی کی پسند تو لاجواب ہے یہ ہمارے اس سیزن کا سب سے مہنگا جوتا ہے جسے ہم سیزن کے مڈ میں ہی ڈسپلے کرتے ہیں۔“

”انکل ایسا آپ کے پاس بلیو بھی ہے جو آپ نے ابھی تک ڈسپلے نہیں کیا۔“ سیلز مین کی بات سن کر تانیا نے سرعت سے جواب دیا جسے سن کر پہلے تو سیلز مین مسکرایا لیکن پھر جیسے ہی اس نے تانیا کی بات پر غور کیا تو اس نے اپنا سر گھما کر ریک کی جانب دیکھا جہاں فقط سرخ رنگ کا ہی جوتا پڑا تھا اور یہ بات سیلز مین جانتا تھا کہ بلیو ابھی ڈسپلے نہیں کیا گیا تھا لیکن تانیا یہ سب کیسے جانتی تھی وہ ابھی حیران ہو کر تانیا کی جانب دیکھ ہی رہا تھا جب ایک لمبا تڑنگا شخص جسے دیکھ کر ہمیں پتا چلا کہ وہ ہمارے عقب میں ہی کھڑا یہ ساری باتیں سن رہا تھا آگے آیا اور تانیا کے قریب بیٹھتے ہوئے مسکرا کر بولا

”بیٹی تمہارا نام کیا ہے۔“

اس کے ایسا پوچھتے ہی تانیا دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔

”انکل آپ کو اس سے مطلب۔“

”چلو تانیا ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“ تانیا کو گھبراتا دیکھ کر یومنہ ایسا کرتے ہوئے تانیا کو لے کر باہر کی جانب بڑھی۔ وہ بیٹھا ہوا شخص سراسیمہ سا ہو کر اٹھتے ہوئے میری جانب دیکھ کر اپنے بڑے بڑے پیلے دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے بولا۔

”آپ کی بیٹی بہت خاص ہے وہ کوئی عام بچی نہیں اس میں قابلیت ہے۔“ یہ بات تو ہم دونوں میاں بیوی

بھی جانتے تھے اور ایسی صورت حال میں یومنہ جانتی تھی کہ اسے کیا کرنا ہوتا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ تانیا کو لے کر اس دکان سے باہر چلی گئی تھی۔ میں نے بھی وہاں کھڑے شخص کی بات کا جواب دینا کوئی ضروری نہ سمجھا اور میں آیان کا ہاتھ تھامے آگے بڑھتے ہوئے اس دکان سے باہر نکلنے ہی والا تھا جب مجھے عقب سے اسی شخص کی آواز دوبارہ سنائی دی۔

"میری بات یاد رکھنا تمہاری بیٹی میں خاص قابلیت ہے اس کا خاص دھیان رکھنا۔" میں اس شخص کی بات سن کر لحہ بھر کو رکا لیکن پلٹا نہیں اور پھر تیز تیز ڈگ بھرتا میں پارکنگ تک چلا آیا تھا جہاں یومنہ تانیا کو ساتھ لے پہلے سے گاڑی کے پاس موجود تھی میں نے گاڑی کا لاک اوپن کیا اور پھر سبھی کے بیٹھتے ہی میں نے گاڑی واپس گھر کی جانب بڑھادی۔ راستے میں ہی تانیا اپنی مما اور مجھے بتا رہی تھی کہ وہ انکل اسے اچھے نہیں لگے تھے وہ ڈر گئی تھی اور جب میں نے تانیا کی بات پر ذرا غور کرتے ہوئے اک بار اس شخص کا حلیہ پھر سے اپنی نگاہوں کے سامنے دہرایا تو مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کوئی سفلی علوم کا ماہر شخص تھا۔

تانیا اور آیان ہمارے ایسے بچے نہ تھے جو کہ شادی کے بعد گرے ہوئے پھل کی طرح ہماری جھولی میں آ ٹپکے تھے بلکہ یومنہ اور میں جب کئی برسوں تک اولاد جیسی نعمت کو ترستے رہے تو ہم نے خدا کے حضور گڑگڑا کر دعائیں کی تھیں ہمیں جو اللہ والے لوگ ملتے ہم ان سے اولاد کے لیے دعائیں کراتے، درگاہوں پر حاضری دیتے اور منتیں مانگتے رہے تھے۔ ہماری اولاد تو راتوں کو اللہ کے حضور گڑگڑا کر مانگی دعاؤں، بزرگوں اور اللہ کے ولیوں کی دعاؤں کا ثمر تھا اور جب تانیا ذرا بڑی ہوئی تو ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے عام انسانوں سے زیادہ صلاحیتیں ودیعت فرما کر اس دنیا میں بھیجا تھا جب وہ ننی ننی اسکول جانا شروع ہوئی تو ایک روز اس کی استانی نے ہمیں یہ بتا کر حیران کر دیا تھا کہ جو اسے اگلے روز پڑھانا ہوتا تھا تانیا کو پہلے سے معلوم ہوتا تھا اور اس سے بھی حیران کر دینے والا اس کا جواب ہوا کرتا تھا جب ہم میں سے کوئی اس سے یہ پوچھتا۔ "تانیا بیٹا تمہیں یہ سب کیسے پتا چلتا ہے تو وہ سرعت سے جواب دیتی۔

"مجھ کو اللہ تعالیٰ بتاتے ہیں۔" تب وہ اتنی چھوٹی تھی کہ اس کے اس معصوم انداز پر ہم بے ساختہ ہنس دیا کرتے تھے لیکن اب وہ بڑی ہو رہی تھی اور انسانوں میں پائی جانے والی ایسی قابلیت اور غیر معمولی صلاحیت کا جن عام لوگوں کو ادراک نہ ہوتا تھا میری اور یومنہ کی حتیٰ الامکان کوشش یہی ہوتی تھی ایسے لوگوں سے ہم اپنی بیٹی کو دور ہی رکھیں۔

ہم لوگ اب جس شاہراہ پر سے گزر رہے تھے وہاں سے گھر تک کا فاصلہ زیادہ نہ تھا اور میری نظریں گاڑی ڈرائیو کرتے ہوئے دائیں بائیں دیکھتے ہوئے کسی ریسٹوران کی تلاش میں تھیں، ساتھ ہی میں یومنہ اور بچوں سے پوچھ رہا تھا کہ وہ کیا کھانا پسند کریں گے جب اسی دوران میں ایک ریسٹوران کے نزدیک گاڑی رک چکی تھی میرے ریسٹوران کے نزدیک گاڑی رکتے ہی ایک نوجوان ملازم مینو بک لے کر ہماری طرف بڑھا۔ یہ شہر کا روایتی سا ہوٹل تھا جس کی سج دھج رات ہوتے ہی بڑھ جاتی تھی بار بی کیو سے اٹھتا دھواں، دیسی مرغ کی کڑاہی اور توے پر بنتے کٹا کٹ کی آوازیں راہ چلتے لوگوں کا دور تک پیچھا کرتی تھیں۔ میں نے بھی آرڈر کے لیے ملازم سے مینو بک لے کر یومنہ کی جانب بڑھائی۔ تو اس نے بھی یہ کہتے ہوئے مینو تک مجھے واپس لوٹا دی کہ "ط ہمیں دیر ہو جائے گی آپ مختصر سا آرڈر پیک

کرالیں۔'' یومنہ کی بات سن کرمین نے ملازم کو ذرا جلدی آرڈر پیک کرنے کو کہا اور پھر میری نگاہ ریستوران کے ساتھ ہی ایک بیکری پر پڑی۔ بچے تو میری آفر سن کر جھٹ سے چلنے کو تیار ہو گئے لیکن یومنہ نے کہا کہ وہ گاڑی میں ہی بیٹھے گی یومنہ کا جواب سن کر میں اور بچے بیکری میں پہنچے، جہاں سے سافٹ ڈرنک، جوسز، کیک اور بچوں ے لیے چاکلیٹ لے کر ہم تھوڑی ہی دیر میں واپس پلٹ آئے تھے گاڑی میں واپس پہنچتے ہی ہمارا کھانے کا آرڈر بھی پیک ہو کر آ گیا تھا میں نے بل ادا کیا اور گاڑی گھر کی جانب بڑھادی گھر اب وہاں سے زیادہ دوری پر نہ تھا ہم کچھ ہی دیر میں گھر جا پہنچے تھے۔

گھر پہنچتے ہی یومنہ کھانا میز پر رکھنے میں مصروف ہوگئی تھی کہ اب سبھی کو بہت زوروں کی بھوک لگ رہی تھی یومنہ کے کھانا میز پر لگاتے ہی میں تو جھٹ سے کھانے کو بیٹھ چکا تھا لیکن یومنہ تانیا اور آیان کو زبردستی کھانے کی میز پر لائی تھی وہ جوائے لینڈ سے جیتے کھلونوں سے کھیلنا چاہتے تھے۔

کھانے سے فراغت کے بعد یومنہ بچوں کو ان کے کمرے میں سلانے چلی گئی اور میں اپنے خالق حقیقی اپنے رب سوہنے کا شکر بجالانے کے لیے عشا کی نماز ادا کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ عشا کی نماز ادا کر چکنے کے بعد میں نے جو ایک طویل سجدے سے اپنا سر اٹھایا تو عین اسی لمحے یومنہ بھی بچوں کو ان کے کمرے میں سلا کر اپنے کمرے میں داخل ہوئی تھی میں نے جو اپنا سر گھما کر یومنہ کی جانب دیکھا تو لمحہ بھر کو مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں برسوں پہلے اسی منظر میں جا اترا تھا جب میں یونہی اپنے کمرے میں اپنے خالق حقیقی کے حضور سربسجود تھا اور یومنہ رومی میاں کے کھیل ''منٹ ٹو ون اٹ'' کی کڑی کے سلسلے میں چھپائے رقعے کو میرے کمرے میں کھوجتے پہنچے تھے۔

''چاچو طٰہٰ عالم کے کمرے میں کتابوں والی الماری۔'' یومنہ سامنے کھڑی تھی اور برسوں پہلے وہ جس رقعے کو کھوجتی میرے کمرے میں آ پہنچی تھی اس رقعے پر درج عبارت میرے لبوں سے ادا ہو گئی تھی میں وہیں اپنی جگہ پر بے حس و حرکت کھڑا رہ گیا تھا بڑے ابا، رومی میاں، مصطفیٰ عالم، بھابی، صائم میاں، بابا عبدالقادر مائیکل میرے ماں اور ابا مجھے شدت سے یاد آنے لگے تھے اور میری آنکھیں شدت جذبات سے چھلک پڑی تھیں یومنہ میری ایسی حالت دیکھ کر فوراً میرے قریب آئی اور اس نے مجھے استراحت کے لیے بستر پر لٹا دیا پھر وہ خود بھی میرے پاس بیٹھی دیر تک میرے بالوں کو سہلاتی رہی نہ میں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے اور نہ ہی اس نے اپنے لبوں کو جنبش دی۔

رات کے نجانے کس پہر پھر میری آنکھ لگ گئی تھی اور جو پھر میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا تو میرے ذہن میں ابھی تک خواب میں دکھائی پڑے شخص کے الفاظ کی گونج باقی تھی۔

''تمہاری بیٹی کوئی عام بچی نہیں اس میں خاص قابلیت ہے اس کا خاص دھیان رکھنا۔'' وہی جوتوں کی دکان پر ملنے والا لمبا تڑنگا شخص اپنے پیلے پیلے دانتوں کی نمائش کرتا انگوٹھیوں سے بھرا ہاتھ اٹھا کر مجھے تنبیہ کر رہا تھا میں نے سبھی خیالات کو جھٹک کر اپنے دائیں طرف دیکھا یومنہ گہری نیند میں لگ رہی تھی میں نے کمرے میں پھیلی ملگجی روشنی میں وقت دیکھا سوا پانچ ہو رہے تھے مطلب کچھ ہی دیر میں فجر کی اذانیں شروع ہونے والی تھیں میں نے اٹھ کر وضو کیا اور بچوں کے کمرے میں جا کر دیکھا تو تانیا اور آیان سو رہے تھے میں تانیا کے سرہانے جا بیٹھا اس کی چادر کو اس پر درست کیا اور پھر زیر لب آیۃ الکرسی پڑھ کر میں

چند لمحے اس پر اور ساتھ سورہے آیان پر دم کرتا رہا ایسا کرتے ابھی مجھے وہاں چند گھڑیاں ہی بیتی تھیں کہ فجر کی اذانیں شروع ہوگئیں اور میں اذان کے کلمات سن کر ان کا جواب دینے لگا اذانیں ختم ہوئیں تو میں بچوں کے کمرے سے نکل کر اپنے کمرے میں پہنچا اور پھر یومنہ کو نماز کے لیے جگایا یومنہ کے جاگنے پر میں فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے مسجد چلا گیا مسجد میں نماز کے بعد جمیل، بابا علیم اور چند ایک اور شناسا چہروں سے ملاقات ہوگئی۔ وہ بھی قبلہ اول کعبتہ اللہ کی زیارت اور مسجد نبوی گنبد خضرا روضہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے دیدار کے واسطے پیاسے تڑپ رہے تھے۔ وہ بار بار ذکر ہی ذکر میں میرے ہاتھوں کو چوم کر اپنی آنکھوں کو لگاتے رہے اور میں ان کے سامنے کھڑا سوچ رہا تھا کہ یہ تو ایسی پیاس تھی ایسا عشق تھا جو جسے جتنا نصیب ہو وہ اسے اور پانے کی جستجو میں لگ گیا۔ میں نے پندرہ سال وہاں نمازیں ادا کیں بعد ہر نماز میں میں نے الگ ہی کیفیت کو پایا۔

فجر کی نماز کے بعد جو میں گھر واپس لوٹا تو کوئی مصروفیت تو تھی نہیں، یہی وجہ تھی کہ میں ذرا استراحت کو لیٹ گیا تھا پھر ظہر کے بعد کا وقت چند کاموں میں مصروف گزرا اور عصر کے بعد جو فراغت کے چند لمحے میسر آئے تو میرے بچے تانیا اور ایان اصرار کرنے لگے کہ میں انہیں باہر لے کر چلوں یوں بچوں کے اصرار پر میں انہیں ہمراہ لیے باہر چلا آیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ بچے اپنے گھر کے گردونواح میں موجود بازار اور دکانیں بھی دیکھ لیں گے اور یوں کچھ سیر بھی ہو جائے گی۔

ہم لوگ اب سڑک کے اطراف میں کھڑی بے شمار پھلوں کی بجی ریڑھیوں کے نزدیک سے گزر رہے تھے۔ یہاں محلے سے نکلتے ہی سڑک چار مختلف سمتوں میں بٹ جاتی تھی اور پھر شہر بھر کے اطراف سے اس چوک نما حصے نے لوگوں کی آمدورفت کا سلسلہ رات گئے تک کچھ یوں جاری وساری رہتا تھا کہ یہ شاہراہ ریڑھی بان حضرات کے لیے خاص اہمیت کی حامل تھی۔ پھلوں کی کبھی قسمیں چاہے وہ موسمی ہوں یا بے موسمی یہاں دستیاب تھیں جنہیں دیکھ کر میرا پھل خریدنے کا ارادہ بن ہی رہا تھا کہ جب تانیا نے مجھے آگاہ کیا کہ اس کا ایک جوتا ٹوٹ گیا تھا۔ وہ اپنے ایک پیر کو ذرا زمین پر گھسیٹتے ہوئے چل رہی تھی یہ دیکھ کر میں نے پھل خریدنے کا ارادہ فوری ملتوی کر دیا تھا اور میں تانیا کو لے کر جوتا مرمت کرنے والی دکان پر آ گیا تھا۔ وہ بھی حضرات خان تھے جنہوں نے درخت کے موٹے سے تنے کے عین نیچے پتھروں کی مدد سے چبوترہ سا بنا رکھا تا جس پر بیٹھے وہ جوتے گانٹھتے تھے وہاں پہنچ کر میں نے تانیا کا جوتا خان صاحب کو مرمت کرنے کو دیا تو وہ مجھے دیکھ کر کچھ سوچتے ہوئے مسکرا پڑے۔ جیسے یاد کرنے کی کوشش کر رہے ہوں کہ ایسے شخص کو یہاں پہلے بھی دیکھا تھا' وہاں پاس ہی رکھا ایک جوتا میں نے تانیا کو پہننے کو دے دیا تھا اور اب دونوں بچے تانیا اور ایان جوتا گانٹھتے ہوئے خان صاحب کے ہاتھوں کی حرکت کو بغور دیکھ رہے تھے اور میری نظریں دریک کے اس درخت کو دیکھ رہی تھیں جس کے عقب میں اب سورج غروب ہونے کو تھا مارچ کے آخیر دنوں میں سورج کے غروب ہونے کے قریب مستانی پروائی سی چلنے لگتی تھی۔ دریک کے پیڑ کی نئی پھوٹتی کونپلوں کے ساتھ ہی اپنی بہار دکھاتے اودھے اودھے پھولوں کی دبیز باس فضا میں عجیب حشر بپا کیے ہوئے تھی۔

پھولوں کا رس چوسنے والی مکھیوں' حشرات اور تتلیوں کی غول در غول اوپر منڈلا رہے تھے۔ اوپر ہوائیں ان کی آمدورفت کا ایک نظام رواں دواں تھا تو

میرے عقب میں موجودہ شاہراہ پر بھی زندگی معمول کے مطابق رواں دواں تھی۔ جب در یک کے پھولوں کی دبیز باس میں مجھے اک جانی پہچانی وہی لاہوتی سی خوشبو محسوس ہوئی جو یا تو بابا ربّ نواز کی سنگت میں محسوس ہوتی تھی یا پھر ان کی تحفتاً دی چادر میں سے محسوس ہوتی تھی۔

ایسا محسوس کرتے ہی میں جیسے حرکت میں آ گیا تھا میں نے یکا یک اپنا سر ارد گرد گھما کر دیکھا عین اسی لمحے وہ میرے عقب سے نمودار ہو کر آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔

ہنہہ ہو......"اس خوشبو کا محور وہ ذات ہی تھی اور جیسا عمل میں انہیں کرتا دیکھ چکا تھا وہ عمل بھی بابا رب نواز ہی کر سکتے تھے۔ وہ جو کہتے تھے کہ چھوڑ دو میاں اس دنیا کو جو تمہیں اتنے گھاؤ دیتی ہے جہاں لوگ فقط اپنے سواد کے لیے جیتے ہیں ان لوگوں کے بیچ رہو گے تو انہی کے جیسا ہونا پڑے گا پھر تم گھاؤ سہتے سہتے خود بھی ایک دن انہی کی طرح کانٹا بن جاؤ گے اور یہ سلسلہ یونہی چلتا رہے گا۔ وہی بابا رب نواز جو میرا ہاتھ چچا مرزا کے ہاتھ میں تھما کر پھر مجھے انہی لوگوں کے بیچ چھوڑ گئے تھے اور آج یوں اچانک برسوں بعد مجھے دکھائی پڑے تھے۔

وہ اک عمل بار بار دہرا رہے تھے اک بار اپنے سر کو سینے پر جھکائے کوئی تسبیح زیر لب پڑھتے اور پھر جو وہ ایک دم سے اپنے سر کو اٹھاتے تو اک بار دائیں طرف کے انسانوں، حیوانوں، چرند پرند، حشرات اور در و دیوار پر اس کی تسبیح کی برکات کو پھونکتے تو دوسری بار ایسا ہی عمل وہ دائیں طرف دہراتے آگے بڑھے چلے جا رہے تھے۔ ایسا دیکھ کر مجھے پختہ یقین ہونے لگا تھا کہ ہو نہ ہو وہ بابا رب نواز ہی ہو سکتے تھے اس سے پہلے کہ میں بے ساختہ ان کے تعاقب میں چل پڑتا میں تانیا کو وہیں اپنے بھائی کے پاس ٹھہرنے کا کہہ کر سرعت سے آگے بڑھ گیا۔ اب میں بابا جی کے تعاقب میں تیز تیز قدم بھرتا چلا جا رہا تھا اور میرے سینے میں میرا دل تھا کہ عجب سے انداز میں پگھلا جا رہا تھا تبھی ان کے اور اپنے درمیان فاصلہ ذرا کم ہوتے ہی میں نے انہیں پکارا۔

"بابا رکیے میں......طٰہٰ......" وہ میری آواز سن کر ذرا فاصلے پر جا کر رکے لیکن پلٹے نہیں۔ میں تیزی سے آگے بڑھ کر ان تک پہنچا اور جو میری نگاہ ان کے چہرے پر پڑی تو جیسے میں بھونچکا سا ہو کر رہ گیا۔ سراپا بھی وہی تھا خوشبو بھی وہی تھا لیکن وہ میرے بابا رب نواز نہ تھے میں سراسیمہ سا ہو کر بولا۔

"معاف کیجیے گا بابا جی! میں سمجھا آپ میرے بابا رب نواز ہیں لیکن یہ خوشبو یہ سراپا یہ میرے بابا ربّ نواز سا ہی ہے، وہ ایسی ہی خوشبو لگاتے تھے۔"

ہم لوگ عین سڑک کے کنارے کھڑے تھے میری بات سن کر میرے سامنے بابا رب نواز جیسے حلیے میں کھڑے بابا جی نے اپنی سرمہ لگی روشن نگاہوں سے ایک بار مجھے سر تا پاؤں یوں دیکھا جیسے ان کی نگاہیں ایکسرے مشین ہو جو میرے وجود کے آر پار دیکھ سکتی ہوں یکا یک وہ اپنے بھاری ہاتھوں سے مجھے میرے کاندھوں سے تھامے ذرا ایک طرف سڑک سے کچھ فاصلے پر لے گئے اور کچھ توقف کے بعد بولے۔

"طٰہٰ میاں بابا رب نواز اب اس دنیا میں نہیں رہے۔" میرے سامنے کھڑے بابا جی نے جو مجھے یہ بُری خبر سنائی تو جیسے مجھ پر قیامت ٹوٹ پڑی گویا میرے دماغ کے قریب کوئی بم پھٹا ہو اور مجھے کان پڑی آواز نہ سنائی دے رہی ہو چند گھڑیوں تک میں ایسی ہی حالت سے دوچار بابا جی کے سامنے کھڑا آنسو بہاتا رہا اور پھر جب میری آنکھوں کے ساغر

تھے اور میں اپنے گردونواح میں کچھ بھی سننے کے قابل ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر جھٹکا لگا کہ اب بابا جی وہاں نہ تھے۔ میں جھٹ سے پلٹا وہ مجھے تیز تیز ڈگ بھرتے پہلے سا عمل دہراتے آگے بڑھتے دکھائی دیئے۔

وہ میرے بابا رب نواز تو نہ تھے لیکن ان میں میرے بابا رب نواز کی خوشبو باقی تھی ایسا خیال آتے ہی میرے دماغ میں اک جھماکا سا ہوا۔

ہو نہ ہو یہ تو عیدے تھے جب ایک اللہ کا ولی اس دنیا سے کوچ کر جائے تو اس کی جگہ خالی تو نہ رہے گی وہ ربّ سوہنا اپنے کسی اور خاص بندے کو وہ منصب سونپ دیتے ہوں گے پھر اب میرے بابا رب نواز کی جگہ ان بابا جی نے لے لی تھی۔ میں بے ساختہ پھر سے ان کے تعاقب میں دوڑا۔

''آپ مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتے ہیں بابا!'' ان کے برابر پہنچ کر میں نے ایسا کہتے ہوئے انہیں روکا۔

''میرے بابا رب نواز اب اس دنیا میں نہیں رہے' آپ ان سے متعلق اتنا سب جانتے ہیں تو پھر آپ میرے لیے اجنبی کیسے ہوئے۔ میں آپ کو ہرگز نہ جانے دوں گا آج آپ کو مجھے اپنی مہمان نوازی کا شرف تو عطا کرنا ہی پڑے گا۔'' وہ میری بات سن کر چند لمحوں تک کچھ سوچتے رہے پھر جیسے انہیں میری حالت دیکھ کر مجھ پر رحم آ ہی گیا۔ وہ میرے ہمراہ چلنے کے لیے راضی ہوئے تو میرے سلگتے سینے میں کچھ راحت کا احساس ہوا میں انہیں ہمراہ لیے خان بابا کی دکان پر پہنچا تو میرے بچے تانیا اور ایان بے چینی سے میرا ہی انتظار کر رہے تھے۔ میرے لوٹنے تک تانیا کا جوتا بھی مرمت ہو چکا تھا۔ میں نے خاص صاحب کو جوتا مرمت کرنے کی اُجرت دی اور گھر کی طرف بڑھتے ہوئے بابا جی کو اپنے بچوں سے ملوایا وہ ان سے مل کر بے حد خوش ہو گئے انہوں نے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیر کر انہیں دعا دی۔

ہمارے گھر پہنچنے تک مغرب کا وقت ہو چکا تھا' گھر پہنچ کر بابا جی یومنہ سے بھی ملے اسے بھی سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی اور میں یومنہ سے بابا جی کے آرام و طعام کا بندوبست کرنے کا کہہ کر ان کے ہمراہ مغرب کی نماز ادا کرنے مسجد کی جانب چل پڑا۔

جب میں اور بابا جی مغرب کی نماز مسجد میں ادا کر کے گھر لوٹے تو تب تک یومنہ بھی نماز سے فراغت کے بعد دسترخوان بچھا کر کھانا رکھ چکی تھی پھر میں نے اور بابا جی نے ہاتھ دھوئے اور ہم کھانا تناول کرنے بیٹھ گئے۔ کھانا کھاتے ہوئے اس قدر خاموشی تھی کہ میں باآسانی سن سکتا تھا کہ وہ ہر لقمے کے ساتھ بسم اللہ اور الحمدللہ پڑھ رہے ہیں۔ کھانے سے فراغت کے بعد وہیں دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے انہوں نے دعا کی اور پھر اٹھ کر مسواک کرنے چلے گئے۔

اتنے میں یومنہ میرے کہنے پر دسترخوان سمیٹ کر چلی گئی اور میں' میں بھی بابا جی سے عشاء کے وقت تک کے لیے اجازت لے کر کمرے سے باہر چلا آیا تھا۔

کمرے سے باہر آتے ہی یومنہ نے مجھے دو ایک کام بتا دیئے جن سے فراغت پانے تک عشاء کی اذانیں شروع ہو گئیں۔ میں بابا جی کے پاس کمرے میں پہنچا تو وہ بھی عشاء کی نماز باجماعت ادائیگی کے لیے تیار بیٹھے تھے۔ میں نے ان کے نکلنے کے لیے دروازہ کھولا تو وہ میری جانب دیکھ کر مسکرائے اور پھر گھر سے نکل کر ہم خراماں خراماں مسجد کی جانب چل پڑے۔

مسجد میں عشاء کی نماز ادا کرنے کے بعد میں اور بابا جی گھر واپس لوٹے تو میں اپنے سارے اہل خانہ کے ساتھ بابا جی کی خدمت میں بیٹھ گیا تھا۔ وہ اب ایسی گفتگو فرما رہے تھے کہ جس میں چھوٹے بڑے سبھی کی دلچسپی کا سامان تھا۔ انہوں نے تانیا اور ایان کو

اپنے دائیں بائیں بٹھا رکھا تھا۔ وہ باتوں ہی باتوں میں کوئی ایسی پُرمزاح بات کرجاتے کہ بچے بھی ہنسنے لگتے یوں چند لمحوں میں ہی بچے ان سے قریب ہوگئے تھے پھر وہ خصوصاً تانیا سے مخاطب ہوئے۔

''تانیا بیٹا آپ کو کسی چیز سے ڈر تو نہیں لگتا؟'' تانیا بابا جی کی بات سن کر جیسے کچھ سوچنے لگی اور پھر یونہی سوچتے ہوئے بولی۔

''جی بابا! مجھے رات خواب میں دکھائی دیتے مونسٹرز سے بہت ڈر لگتا ہے۔'' تانیا کی بات ختم ہوتے ہی یومنہ بھی بابا جی کو بتانے لگی کہ تانیا اکثر رات کو ڈر جاتی ہے اور میں نے بھی پچھلے چند روز پہلے تانیا کے ساتھ پیش آیا واقعہ بابا جی کے سامنے بیان کردیا۔ بابا جی ہماری باتیں سن کر مسکرائے اور پھر تانیا سے بولے۔

''تانیا بیٹا آپ تو بہت بہادر ہیں' آپ ایسے مونسٹرز سے لڑسکتی ہو آپ کو آیتہ الکرسی اور تیسرا کلمہ آتا ہے؟'' بابا جی کی بات سن کر تانیا نے بنا کسی غلطی کے آیتہ الکرسی اور تیسرا کلمہ سنا دیا۔ بابا جی نے تانیا کے ننھے منھے سے ہاتھ پر بوسہ دیا اور پھر مٹھی بند کرتے ہوئے بولے۔

''اب آپ اپنی بند مٹھی پر پڑھی جانے والی آیات پھونکو اور یوں مٹھی سامنے مونسٹرز کی طرف کرکے کھول دو بس سارے مونسٹرز آپ سے ڈر کر بھاگ جائیں گے۔'' بابا جی کی باتیں سن کر تانیا کے اعتماد میں بہت اضافہ ہوا جیسے اسے بابا جی نے ایسا عمل بتادیا تھا کہ اب وہ بنا جادو کی چھڑی کے مونسٹرز سے لڑسکتی تھی یونہی بابا جی کی سنگت میں وقت بیتنے کا احساس ہی نہیں ہوا جب میں نے محسوس کیا کہ اب ہمیں وہاں سے اٹھنا چاہیے تاکہ بابا آرام کرسکیں۔ یوں بچوں اور یومنہ کے ساتھ میں نے بابا جی سے اجازت لی اور وہ ذرا استراحت کرنے کو لیٹ گئے۔

اگلے روز جب بابا جی سب سے الوداعی ملاقات کررہے تھے اور میں انہیں چھوڑنے کے لیے گھر کے بیرونی دروازے تک چلا گیا۔ وہ میرے ہمراہ چلتے ہوئے کسی گہری سوچ میں لگ رہے تھے بیرونی دروازے سے باہر پہنچ کر وہ رکے اور مجھے ہدایت کرنے لگے کہ طٰہٰ اب گھر لوٹ جاؤ تمہارے ابا کو اس وقت تمہاری ضرورت ہے۔ بابا جی کی کہی یہ بات سن کر میں ایک دم سے چونکا۔ پرانے درد اور ان کی کسک پھر سے جاگ اٹھے تھے۔ میں مضطرب سا کھڑا نہ جانے کن لمحوں میں جا اترا تھا' جب بابا جی نے میرا دھیان بٹانے کے لیے میری بیٹی تانیا کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ مجھ سے مخاطب تھے۔

''طٰہٰ میاں! تانیا کا تمہیں خاص خیال رکھنا ہے تو اور یومنہ بیٹی یہ بات تو جانتے ہی ہو کہ وہ کوئی عام بچی نہیں اور ایسے انسان جن میں یہ خاص قابلیت پائی جاتی ہے وہ نہ صرف انسانوں کی توجہ کا باعث بنتے ہیں بلکہ کئی ماورائی قوتیں بھی ایسے انسانوں کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کی کوشش کرتی ہیں۔ کبھی اچھائی کی خاطر تو کبھی برائی پھیلانے کے لیے۔ اس بات کا خاص دھیان رکھنا کہ جب تک تم پاکستان میں ہو تانیا کو کبھی پاکستان کے شمال مشرقی حصے میں نہ لے کر جانا بلکہ میں چاہوں گا کہ تم اسے لے کر جتنا جلد ہوسکے سعودی عرب لوٹ جاؤ۔'' میں جو دم سادھے بے حس و بے حرکت کھڑا بابا جی کی باتیں سن رہا تھا۔ ان کی باتوں کا مفہوم سمجھ چکا تھا کہ وہ مجھے کیا سمجھانا چاہتے تھے۔ میں نے انہیں تانیا اور اپنے باقی اہل و عیال کے لیے دعا کرنے کو کہا تو وہ مجھے ایک بار اپنے سینے سے لگا کر میرے ہاتھوں میں ایک رقعہ تھما کر چلے گئے۔ ان کے جانے پر میں وہی کھڑا سوچ رہا تھا کہ ان میں اور میرے بابا رب نواز میں کس قدر

مماثلت تھی۔ وہ بھی مجھے جب چھوڑ کر جایا کرتے تھے کچھ نہ کچھ سونپ جایا کرتے تھے۔ میں نے سرعت سے وہ رقعہ کھلا اور میری متجسس نگاہیں جب رقعے پر درج تحریر پر پڑیں تو اس پر وہی پرانی عبادت درج تھی۔

"نفرت انسان سے نہیں بلکہ اس سے سرزد ہوئے گناہ سے ہونی چاہیے۔" یہ عبارت پڑھتے ہی میرے ذہن میں ایک ساتھ کئی جھماکے ہونے لگے۔

"یہ بات تو میں جانتا تھا......نہیں نہیں...... ہرگز نہیں......" میں اس عبارت کا مفہوم آج تک سمجھ ہی نہ پایا تھا اگر ایسا ہوتا تو پھر میں اپنے ابا کی اذیت وہ باتوں کو سہتا یوں حقیقت سے نگاہیں چرا کر گھر نہ چھوڑتا۔ برسوں یوں اپنوں سے کٹ کر نہ رہتا ایک اذیت میں انہیں مبتلا کر کے ایک اذیت خود بھی سہتا رہا اور یہی سوچتا رہا کہ میں ہی صحیح ہوں اگر وہ غلطی پر ہی تھے تو صحیح میں بھی نہ تھا۔ اگلے کئی روز تک میں اسی کشمکش میں مبتلا ماہی بے آب کی طرح تڑپتا سوچتا رہا کہ میں گھر لوٹوں تو آخر......لوٹوں کیسے۔ میں راتوں کو سجدوں میں پڑا روتا رہا' بلکتا رہا' تڑپتا رہا' سوہنے رب کے حضور گڑگڑاتا رہا پھر رب سوہنے کو میرے تڑپنے پر رحم آ ہی گیا اور اس نے میری ساری مشکلیں آسان کر دیں۔

اگلے چند روز بعد ہی مصطفیٰ عالم اور ماں میرے پاس گھر آ پہنچے انہیں میرے اس گھر کا پتا چچا مرزا نے دیا تھا اس روز وہ بڑا ہی رقت انگیز منظر تھا ماں کئی گھڑیوں تک مجھے' یومنہ اور بچوں کو چومتی اپنے سینے سے لگاتی رہی۔ مصطفیٰ عالم بھی یوں برسوں بعد مجھ سے مل کر آبدیدہ لگ رہے تھے اور ان کی زبان بار بار ایک ہی کلمات دہرا رہی تھی۔

"طہ تجھے ہماری ذرا سی یاد نہیں آئی۔" میں ان کی ایسی باتوں کا بھلا کیا جواب دیتا میری آنکھوں کے ساغر ہی انہیں میری بپتا کے نغمے سناتے رہے۔ پھر ماں اور مصطفیٰ عالم اسی گھڑی اپنے ساتھ لے جانے کے لیے اصرار کرنے لگے اور میں جو سرتاپا ان کی محبت میں بھیگ رہا تھا اب اور دوری نہ سہہ سکتا تھا۔ میں جھٹ سے ان کے ہمراہ چلنے کو راضی ہو گیا تھا اور اسی روز میں یومنہ' بچے' مصطفیٰ عالم اور ماں گھر کی جانب چل پڑے۔

گاڑی محلّہ مومن پورہ سے نکل کر شہر کی خاص شاہراہ پر رواں دواں تھی چار سوا چار گھنٹے کی طویل مسافت تھی اور ہماری گاڑی ابھی تک شہر کے سگنل پار کر رہی تھی۔ جب گاڑی ایک سگنل پر جار کی تو جیسے میرے دل کی دھڑکن بے قابو ہونے لگی تھی۔ مسافت طویل منزل دور اور یہ تاخیر میرے درد اور اذیت کا سبب بن رہی تھی۔

جب سے ماں نے آ کر یہ بتایا تھا کہ ابا کی طبیعت بہت خراب ہے' میں ان سے ملنے کے لیے بے تاب ہو رہا تھا۔ اپنے ابا کی خراب طبیعت کا سن کر میری نگاہوں کے سامنے وہی منظر بار بار آ جاتا تھا جب ہم نے آہوں سسکیوں میں اپنے بڑے ابا کو کھویا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں ان بُرے خیالات سے پیچھا نہ چھڑا پا رہا تھا ایک سگنل کھلا تو مصطفیٰ عالم نے گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ آگے بڑھا دی میں ان کے مقابل سیٹ پر ہی بیٹھا تھا اور ہمارے عقب میں ماں' بچے اور یومنہ بیٹھی تھی سبھی خاموش تھے اور ہمارے عقب میں محلّہ مومن پورہ اب کافی پیچھے رہ گیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا اور مجھے ابھی یہ کل ہی کی بات لگتی تھی برسوں پہلے جب بابا رب نواز نے میرے ابا خورشید عالم اور چچا مرزا کے درمیان دوری کو میرے اور یومنہ کے لگن سے مٹا ڈالا تھا اور خاندان برسوں بعد ماضی کی تلخیاں فراموش کر کے پھر سے ایک ہو گیا تھا۔

بڑے ابا کی کمی تو شدت سے محسوس رہتی تھی لیکن خاندان بھر کے پھر سے جڑ جانے اور چچا مرزا سے رشتہ اور گہرا مضبوط ہو جانے سے میرے ابا خورشید عالم بھی بے حد خوش تھے۔ میں نے ان کی سیاست میں بھی ان کے ہمراہ ایک وقت گزارا تھا ان کی جائز، ناجائز کمائی کی پائی پائی کا حساب میں جانتا تھا اور پھر جب بابا رب نواز کی سنگت میں اس دنیا اور اس کی حقیقت کا ادراک ہوا تو اب میرا من چاہتا تھا کہ میں ابا سے کہوں کہ وہ ناجائز کمائی کو اپنے مال سے الگ کر دیں۔ مجھ میں اب اور سہنے کی قوت نہ تھی۔ میں ابا کو اس فانی دنیا کی طلب میں اس تباہی کی راہ پر گامزن نہ دیکھ سکتا تھا۔ روز میرے پاس ایسے کئی لوگ آتے جن سے مجھے معلوم پڑتا کہ شہر بھر کی فلاح و بہبود کے نام پر ملنے والا فنڈ ابا کی تجوریوں میں پہنچ چکا تھا اور اُدھر شہر کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ ناقص صفائی، کچرے اور غلاظت کے ڈھیر، نالیوں سے بہتا گندا پانی خراب سیوریج سسٹم کی بدولت متعدد علاقوں میں وباء پھوٹنے کا خدشہ لگا تھا اہل علاقہ کے مسکین اور غرباء کے لیے ملنے والی امداد ان تک نہ پہنچتی تھی۔

ایسا سب دیکھ کر میرا جی کڑتا اور میرا من چاہتا کہ میں ابا کو بھی اسی راہ پر چلنے کی دعوت دوں جس راہ پر چلنے سے ہماری نجات وابستہ تھی تو ایک روز ایسی ہی نیت سے میں ابا سے ملا وہ میری باتیں یوں سنتے رہے جیسے انہیں لامحالہ میری باتیں سننا پڑ رہی ہوں۔ یکا یک وہ اٹھے اور مجھے اتنا کہہ کر چلے گئے کہ وہ میری باتوں پہ غور کریں گے۔ مجھے اس انداز سے ان کا یوں اٹھ کر چلے جانا معیوب لگ رہا تھا لیکن میں بھی ہمت ہارنے والا کہاں تھا میں پھر سے اسی جستجو میں لگ گیا کہ مجھے کوئی مناسب موقعہ میسر آ جائے تو میں ابا سے پھر سے بات کروں جب ایک روز ایسا موقعہ میرے ہاتھ لگ ہی گیا۔

ایک روز میں عصر کی نماز ادا کر کے مسجد سے گھر پہنچا تو گھر داخل ہوتے ہی میری نظر ابا پر پڑی وہ لان میں پڑی کرسیوں اور میز پر بہت سی فائلیں پھیلائے بیٹھے تھے۔ میں دھیرے سے چلتا ان تک پہنچا اور ہولے سے سلام کرنے کے بعد ان کے نزدیک ہی ایک خالی نشست پر جا بیٹھا۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے یکبارگی سر اٹھا کر میری جانب دیکھا اور وہ پھر سے اپنے کام میں لگ گئے۔ میں ان کے سامنے بکھری کاروباری اور جائیداد کے اثاثوں کی فائلیں دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ وہ یہ سب آخر کس کی خاطر کر رہے تھے اس قدر سخت تگ و دو دن رات کی سخت مشقت کبھی اندرونِ ملک دور دراز تک کا سفر تو کبھی بیرونی ممالک کاروبار کے سلسلے میں ان کا آنا جانا اگر وہ جائز وہ ناجائز کو پس پشت ڈال کر یہ سب اپنی اولاد کی خاطر کر رہے تھے۔ یہ سخت تگ و دو وہ ہماری خاطر کر رہے تھے تو وہ سراسر گھاٹے کا سودا کرتے تھے۔

اپنی آخرت تو وہ تباہ کر ہی رہے تھے ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی اولاد میں بھی غلاظت کے زہر کو بھر رہے تھے اور مجھے جب سے رب سوہنے نے اپنی قدرتِ ثنائی سے یہ ادراک یہ آگاہی دلائی تھی۔ اب اپنے ابا کو اس راہ پر گامزن نہ دیکھ سکتا تھا انہیں خود کو اپنی اولاد کو ایسی تاریک راہوں میں بھٹکتا نہ دیکھ سکتا تھا ایسا سوچتے ہوئے میں انہیں مخاطب کرنے ہی والا تھا جب میں نے محسوس کیا کہ وہ ابھی اپنے کام میں بے حد مصروف لگ رہے تھے میں چند لمحوں تک ان کے فراغت پانے کا انتظار کرتا رہا لیکن پھر انہیں کام میں مصروف دیکھ کر میں نے ان سے بات کرنے کا ارادہ ملتوی کیا اور وہاں سے چلنے کے لیے جیسے ہی اٹھا وہ جھٹ سے بولے۔

''بیٹھو طہٰ! کوئی خاص کام تھا۔'' اتنا کہہ کر وہ پھر

سے کام میں لگ گئے اور میں جو کہ ابھی اٹھ کھڑا ہوا تھا ان کے ایسا کہتے ہی پھر سے بیٹھ گیا اور میں بیٹھتے ہی سوچنے لگا کہ میں اب کی بار ابا سے صاف صاف لفظوں میں اپنے دل کی ساری بات کہہ دوں گا اور پھر میرے جذبات میری زبان سے لفظوں کی صورت میں عیاں ہونے لگے۔

''ابا...... یہ دنیا اور اس کی یہ رونقیں تو عارضی ہیں یہ روپیہ پیسہ دولت عزت' شہرت تو آنی جانی ہے۔کام آئے گا تو فقط عمل اور جب تک سانس باقی ہیں عمل کرنے کا وقت بھی باقی ہے۔ابا آپ وہ پیہ الگ کر دیں جو آپ کا نہ تھا لیکن دنیا کی حرص نے آپ کے من میں اس کی رغبت دلائی اور آپ شیطان کے بہکاوے میں آ کر اسے اپنا دھن مان بیٹھے۔'' اب کی بار میں نے ابا سے ذرا کھلے لفظوں میں بات کر ڈالی تھی میں نہیں جانتا تھا کہ ان کی شفقت پیار تو ایک طرف رشتوں کی بڑائی بھی ان کی نگاہ میں کوئی وقعت نہ رکھتی تھی۔ان کے نزدیک دولت ہی سب سے بڑی طاقت تھی یہ رشتے ناتے یہ محبتیں سبھی اسی کے گرد گھومتی تھیں۔ وہ میری باتیں سن کر سراسیمہ سا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے ان کے چہرے کا رنگ لال پیلا ہو رہا تھا۔شدید غصے کے عالم میں بھرائی ہوئی آواز میں بولے۔

''میں شیطان کے بہکاوے میں آ چکا ہوں' میں شیطان بن چکا ہوں۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے اپنے سامنے رکھی فائلوں میں سے ایک فائل اٹھا کر زور سے ایک جانب اچھال دی۔

''بیگم باہر آ کر سنو یہ تمہارا بیٹا جسے ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن مسجد جاتے نہیں ہوئے مُلا بنا میرے سر پر آن کھڑا ہوا ہے۔'' ابا کے زور زور سے کہے الفاظ سن کر ماں بھابی' مصطفیٰ عالم اور گھر کے ملازم بھی وہاں آ جمع ہوئے تھے۔ابا نے سامنے رکھی چند ایک اور فائلیں یوں ہوا میں اچھال دیں کہ میرے اطراف میں سیکڑوں صفحات فائلوں سے نکل کر اڑ رہے تھے اور ابا کا غصہ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔

''کئی روز سے جو میرا بیٹا مجھ سے کہنا چاہ رہا تھا آج وہ لفظ میری اولاد کی زبان پر آ ہی گئے۔ میں تو شیطان ہوں میں نے سارا حرام کا مال اکٹھا کر رکھا ہے یہ سارا مال جائیداد یں میں نے حرام کی کمائی سے بنائی ہیں۔تم اپنے دادا کی کمائی کو حرام کی کمائی کہہ رہے ہو اور میں نے جو اپنے ابا کی جائیداد پر دن رات لگا کر اسے بڑھایا پھیلا ہے یہ سب کے لیے ہے۔میں جو تم لوگوں کا معاشرے میں عزت وقار بنانے کی خاطر جتا رہتا ہوں' میں تو شیطان ہوں ناں۔ظالم تم نے اپنے باپ کو خوب صلہ دیا' ایسی اولاد ہوتی ہے...... ایسی اولاد نہیں چاہیے مجھے' میں کہتا ہوں جاؤ...... جاؤ تمہیں جیسی زندگی گزارنا ہے تم آزاد ہو اور ہمیں چھوڑ دو ہمارے حال پر......'' ابا کی پُر خار باتیں سن کر بمشکل اپنے پیر زمین پر جمائے کھڑا تھا۔میرا ذہن ماؤف ہو رہا تھا اور میرے ارد گرد جیسے تاریک آندھیاں چل رہی تھیں۔ماں ابا کو سنبھالنے میں لگی تھی مصطفیٰ عالم' بھابی' گھر کے ملازم مجھے متعجب نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔جب میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ میں سمجھتا تھا ابا میری بات سنیں گے وہ جو یہ سب کر رہے تھے وہ سب ہمارے لیے ہی تو تھا اگر وہ اپنی اولاد کی خاطر مشقت میں پڑے تھے تو پھر میری ایسی باتیں بھی وہ دھیان لگا کر سنیں گے لیکن میری کھری واضح باتیں انہیں غلط محسوس ہو رہی تھیں' چبھ رہی تھیں۔ وہ حقیقت کا سامنا ہی نہ کرنا چاہتے تھے وہ میری باتوں کا مفہوم ہی نہ سمجھنا چاہتے تھے اور پھر ابا کی ایسی باتوں پر جو میری آنکھیں چھلک پڑیں تو میں بھرائی ہوئی آواز میں فقط اتنا ہی بول پایا تھا۔

"میں نہیں رہوں گا...... میں ابھی اسی وقت یہاں سے چلا جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر میں اپنے کمرے کی طرف بڑھنے کے لیے پلٹا تو میرے عقب میں یومنہ کھڑی تھی شاید وہ یہاں ذرا دیر سے پہنچی تھی اس کی زبان خاموش تھی لیکن اس کی نگاہوں میں ان گنت سوال تھے اور میں اس کے سوالوں کے جواب دینے کی حالت میں نہ تھا۔ میں اسے یونہی ششدر کھڑا چھوڑ کر اپنے بھاری قدموں کو اٹھاتا آگے بڑھا جب مجھے میرے عقب سے ابا کی پھر سے آواز سنائی دی۔

"جاؤ میاں شوق سے جاؤ...... دو چار دنوں میں جب آٹے دال کا بھاؤ پتا چل جائے تو بے شک لوٹ آنا۔" میں جو لمحہ بھر کو ابا کی بات سننے کے لیے رکا تھا تو پھر آخری بات سن کر اک پل مزید وہاں نہ ٹھہر سکا اور تیز تیز ڈگ بھرتا اپنے کمرے میں چلا آیا۔ کمرے میں پہنچ کر کمرے کے اطراف میں نظر دوڑاتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ وہاں ایسا کیا پڑا تھا جو میرا تھا جو میں اپنے ساتھ لے جا سکتا تھا۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا جب یومنہ بھی میرے عقب میں کمرے میں آ پہنچی تھی چند لمحوں تک وہ میرے عقب میں ہی خاموش کھڑی رہی اور میں بھی پلٹے بنا سوچ رہا تھا کہ کیا یومنہ میرے فیصلے پر راضی ہوگی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا جب اس نے میرے عقب سے آ کر اپنا سر میرے کندھے پر رکھا اور بولی۔

"طہٰ آپ یہی سوچ رہے ہیں ناں کہ آپ یہ بات مجھ سے کیسے کہیں کہ میں آپ کے ساتھ آ رہی ہوں یا نہیں تو سن لیں زندگی کے ہر موڑ پر میں آپ کے ساتھ ہوں اگر آپ میرے ساتھ ہوں تو میں زندگی میں آئی ہر آزمائش سے لڑ سکتی ہوں۔" مجھے یومنہ کی بات سن کر اپنی قسمت پر رشک آ رہا ہے۔

اباجو کہ شاید یہ سوچ رہے تھے کہ جو یہ ملا بن بیٹھا ہے تو میرے ایسے رویے سے دلبرداشتہ ہو کر جائے گا بھی کہاں، اپنے سسرال، میرے بھائی مرزا کے ہاں چلا جائے گا مجھے کیا فرق پڑتا ہے وہ بھی تو اپنا ہی گھر ہے لیکن وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ میں اگر گھر سے ایک بار جانے کا ارادہ کر لوں گا تو پھر مجھے کسی کی کوئی ہمدردی کوئی مدد درکار نہ ہوگی تب میں نے یومنہ کو اپنے ساتھ لیا اور گھر سے نکلتے ہوئے فقط وہ قلم اور برش اٹھائے جن سے میں اسلامک کیلی گرافی کیا کرتا تھا میری جیب میں کچھ پیسے تھے جو پچھلے روز میرے چند فن پاروں کی فروخت پر ملے تھے۔

میں نے ادھورے کینوس بھی اپنے ساتھ اٹھائے اور گھر سے چل نکلا، ماں مصطفیٰ عالم اور بابا عبدالقادر ہمیں روکنے دروازے تک آئے لیکن میں ابا کی اس ظلمت سے بھری سلطنت میں ایک پل بھی اور نہ ٹھہرنا چاہتا تھا۔ میرا فیصلہ اٹل تھا اور دل میں گھر چھوڑنے کا ذرا ملال نہ تھا۔ اگر کلیجہ چھلنی ہوئے جا رہا تھا تو فقط اپنے ان رشتوں کو چھوڑنے کی وجہ سے جو مجھے جاتا دیکھ کر روکنے کے واسطے گھر کی چوکھٹ تک چلے آئے تھے اتنے میں ایک رکشہ ہمارے پاس سے گزرا تو میں نے اسے رکنے کا اشارہ کیا رکشے کے رکتے ہی میں اور یومنہ اس میں سوار ہوئے تو رکشہ چل پڑا۔ میں اجنبی راستوں پر قدم بڑھا چکا اور یہ نہیں جانتا تھا کہ منزل کہاں ہے اور رکشے والا بھی متعدد بار پوچھ چکا تھا کہ ہمیں کہاں اترنا ہے اور میں بھی اسی کشمکش کا شکار تھا جب میرے دوست جمیل کی کال آ گئی اور میں نے اسے سب سچ بتا دیا پھر اس کے اصرار پر میں اسٹیشن پہنچا اور سیکڑوں میلوں کی مسافت طے کر کے محلہ مومن پورہ چلا آیا۔

جمیل کے گھر آ کر جو اپنائیت اور پیار ملا ہمیں یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ ہم کسی اجنبی کے گھر چلے آئے

تھے لیکن میں جمیل اور اس کے اہل خانہ پر بوجھ نہ بننا چاہتا تھا میں نے چند روز گزرتے ہی ملازمت کے لیے جدوجہد شروع کر دی چند ہی روز کی جدوجہد سے مجھے ایک اخبار کے دفتر میں کتابت کی ملازمت مل گئی تو میں نے جمیل سے ضد کر کے اسی محلے میں ایک کرائے پر مکان لے لیا۔

اخبار کے دفتر سے واپسی پر میں گھر پہنچ کر کینوس پر اسلامی کیلی گرافی کرتا اور پھر جو فن پارے تیار ہو جاتے انہیں شہر کی مختلف دکانوں پر دے آتا تھا چند ایک دکان دار حضرات ایسے بھی تھے جنہیں میرا کام بے حد پسند آیا اور وہ مجھ سے آرڈر پر بھی فن پارے بنوانے لگے تھے یوں دشوار دن دھیرے دھیرے سہل دنوں میں ڈھلنے لگے تھے۔ میں جس محلے میں رہائش پذیر تھا اپنے گردو نواح میں بستے لوگوں کو دیکھتا تو میری ہمت اور بڑھ جاتی تھی۔ بابا علیم بھی ایسے ہی بلند حوصلہ باہمت انسان تھے۔ میں اکثر انہیں کہتا۔

"بابا بھی آپ کے بچے بچیاں تو پڑھ لکھ کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو چکے ہیں پھر آپ ابھی تک مٹر چاول کیوں بیچتے ہیں؟" بابا جی میری باتیں سن کر مسکرا دیتے اور مجھ سے کہتے۔

"طہٰ بیٹا میں اگر اپنے پروردگار کا شکر ادا کرنا چاہوں تو میرے ایسے کئی جیون بھی کم پڑ جائیں۔ رب العزت کے مجھ پر اس قدر احسان ہیں اس نے مجھ جیسے معمولی انسان کو کیا کچھ نعمتیں عطا کر دیں۔ آج میری اولاد پڑھ لکھ کر اعلیٰ عہدوں پر فائز ہے میرے بچے بسا اوقات مجھے کہتے ہیں کہ ابا اب آپ ریڑھی نہ لگایا کریں لیکن میں اس بات کو ہرگز نہیں بھولتا کہ پہلے میں کیا تھا۔ میں آج بھی ریڑھی پر اس لیے مٹر چاول بیچتا ہوں کہ روز مجھ سے سیکڑوں انسان فقط بیس روپے میں اپنا پیٹ بھر کھانا کھا لیتے ہیں۔ مجھ ناچیز پر رب سوہنے کی شاید اسی لیے اتنی رحمتیں ہیں۔" بابا علیم کی ایسی دل کو لگتی باتیں سنتے ہوئے میں اکثر اپنے اور یومنہ کے لیے بھی مٹر چاول پیک کروا لیا کرتا تھا اور جو ذائقہ ان کے مٹر چاول میں ہوتا تھا وہ اکثر یومنہ بھی مجھ سے کہتی کہ میں بابا جی سے پوچھوں کہ وہ ایسا کیا شامل کر دیا کرتے تھے کہ خود یومنہ سے بھی ویسے چاول نہ بنتے تھے۔

یومنہ نے جس صبر اور حوصلے سے میرے سنگ وہ دن بتائے اور زبان سے ایک لفظ شکوے کا نہ نکالا تھا یہ شاید اسی صبر اور حوصلے کا پھل تھا کہ ایک روز اخبار کے دفتر میں ہی بیٹھے بیٹھے میں نے ایک اشتہار دیکھا جس میں سعودی عرب کی ایک فیکٹری جو "کسوا" خانہ کعبہ کا غلاف تیار کرتی تھی انہیں اسلامی کیلی گرافی جاننے والے ماہر کاریگر درکار تھے۔ میں نے اسی روز اخبار پر درج پتے پر فارم پُر کر کے ارسال کر دیے تھے میرے فارم ارسال کرنے کے چند روز بعد ہی مجھے انٹرویو کے لیے بلا لیا گیا تھا۔

سعودی عرب سے باقاعدہ ایک وفد آیا ہوا تھا جن میں شامل حضرات نے نہ صرف مجھ سے مختلف سوالات پوچھے بلکہ وہ کئی گھنٹوں تک مجھ سے قلم اور برش کے استعمال سے کیلی گرافی کا مختلف کام لیتے رہے۔ میں انٹرویو دینے کے لیے آتے ہوئے یومنہ سے کہہ آیا تھا کہ وہ میرے لیے دعائیں کرتی رہے پھر ضرور وہ قبولیت کی گھڑی رہی ہو گی کیونکہ وفد نے مجھے سلیکٹ کر لیا تھا۔

اگلے چند روز میں نے یومنہ اور اپنا پاسپورٹ بنوایا اور پاسپورٹ ملتے ہی چند ہی روز بعد ہم دونوں جدہ ائرپورٹ جا اترے۔ جہاں فیکٹری کی گاڑی پہلے سے ہمارے استقبال کے لیے کھڑی تھی ہم دونوں گاڑی میں سوار ہوئے تو گاڑی ہمیں لے کر کمپنی کی طرف سے ملنے والی رہائش گاہ کی طرف

چل پڑی۔ مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں' ابھی میری آنکھ کھل جائے گی اور میں اس سپنے کی حقیقت سے کوسوں دور محلہ مومن پورہ میں اپنے بستر پر سو رہا ہوں گا۔ میں اپنے ساتھ ہی بیٹھی یومنہ کی طرف متوجہ ہوا میری طرح جیسے اسے بھی یقین ہی نہ آرہا تھا کہ ہم یوں چند روز میں ہی سعودی عرب آ پہنچیں گے اور وہ بھی ایسے کام پر مامور جو دنیا کے چند گنتی کے خوش نصیب لوگوں کے حصے میں ہی آتا ہے۔

اسی سال میں نے اور یومنہ نے پہلے حج کی سعادت حاصل کی اور اسی سال میرے ہی ہاتھوں میں تیاری سے گزرا ''کسوا'' خانہ کعبہ پر موجود تھا۔ خالص ریشم' سونے اور چاندی کے تاروں سے بنا کسوا جس پر نگاہ پڑتے ہی پتھر سے پتھر دل انسان بھی موم کی طرح پگھلنے لگتا تھا۔ دنیا جسے چھونے کے واسطے' جس کے ایک چھوٹے سے حصے کو پانے کے لیے تڑپتی تھی۔ سارا سال وہ ہمارے ہی ہاتھوں میں تیاری کے مراحل سے گزرتا تھا۔

لیکن اب وہ فقط ریشم واطلس سونے وچاندی کے تاروں سے بنا کپڑا نہ رہا تھا۔ اب تو وہ قبلۂ اول کی زینت تھا۔ پہلے وہ مٹی سے گوندھا آدم تھا جس میں ابھی روح نہ پھونکی گئی تھی جس میں زندگی کی کوئی رمق نہ تھی۔ وہ ایک مجسمہ تھا اور اب وہ ایک جیتے جاگتے آدم کی طرح بے مثال تھا جیسے آدمؑ کو تمام مخلوقات پر فوقیت دی گئی تھی۔ یونہی اب ریشم واطلس سونے و چاندی سے بنے کسوا کو دنیا کے ہر کپڑے پر فوقیت حاصل ہوگئی تھی۔ اس میں بے پناہ نور بھر گیا تھا' ایسی زبردست مقناطیسیت' جذب پیدا ہوگیا تھا کہ نظر نہ ٹھہرتی تھی۔ دیکھتے ہی دل بے قرار ہوجاتا تھا اس پر مرمٹنے کو جی چاہتا تھا۔ اس میں کہیں جذب ہوجانے کو من کرتا تھا یونہی کسوا کو دیکھتے دیکھتے نہ مجھے اپنا ہوش رہا اور نہ ہی یومنہ ہوش میں لگ رہی تھی۔

''طٰہٰ......طٰہٰ چلیے ہم گھر پہنچ گئے ہیں۔'' یومنہ کی آواز سن کر میں نے چونک کر اس کی جانب دیکھا یکایک میرے گردونواح کا سارا منظر ہی بدل گیا تھا۔ میں خیالوں ہی خیالوں میں کہیں بہت دور نکل چکا تھا اور اب خیالوں کے دائرے سے نکلتے ہی میں یومنہ کی آواز سن کر گاڑی سے اترنے لگا۔ گاڑی سے اترتے ہی اپنے خاندان بھر کو سامنے منتظر کھڑا دیکھ کر میں خوشی کے عجب احساس سے سرشار وہیں کھڑا رہ گیا۔ وہی کھڑے کھڑے میں نے ایک نگاہ اٹھا کر گھر کے درودیوار دیکھے جہاں میں نے اپنی حیات کے کئی دور دیکھے تھے۔

''طٰہٰ......اب چلیے ناں سب آپ سے ملنے کے لیے بے تاب کھڑے ہیں۔'' بھی آگے بڑھ چکے تھے جب یومنہ نے پلٹ کر مجھ سے کہا۔ میں وہیں گاڑی کے پاس کھڑا تھا میں نے یومنہ کی بات سن کر یکبارگی اس کی جانب دیکھا وہ مجھے دیکھ کر مسکرائی جیسے کہہ رہی ہو طٰہٰ اب سب ٹھیک ہوجائے گا' آپ قدم تو بڑھایئے میں تو ہر قدم پر آپ کے ساتھ ساتھ ہوں۔

میں نے یومنہ کے ہمراہ آگے بڑھتے ہوئے دیکھا تو چچا مرزا کا سارا خاندان' بھابی' بابا عبدالقادر' مائیکل اور دو ایسے نوجوان سامنے کھڑے تھے جنہیں فی الوقت میں پہچان نہ پایا تھا۔ چچا مرزا نے والہانہ انداز میں آگے بڑھ کر مجھے اپنے سینے سے لگالیا تھا۔ چچی یومنہ سے ملتے ہوئے رو پڑی تھیں' بھابی کی بھی ایسی ہی حالت ہورہی تھی۔ میں فرزند اور دلدار سے مل کر آگے مائیکل کی طرف بڑھا وہ اپنے ہاتھوں سے اپنے چہرے پر بہتے آنسوؤں کو پونچھ رہا تھا تو بابا عبدالقادر تو ایسا بھی نہ کرپائے وہ بے حد ضعیف اور کمزور ہوچکے تھے۔ ان کے برابر میں ہی دو نوجوان چپ چاپ

کھڑے یہ سارا منظر دیکھ رہے تھے مجھے ان کی طرف متوجہ پا کر مصطفیٰ عالم آگے آئے اور کہا۔

”طہٰ! انہیں ذرا پہچانو تو یہ کون ہیں؟“ مجھ سے بھی نکلتا قد‘ گوری اجلی رنگت کچھ کچھ میرے ہی جیسے تھے اور اب میری طرف دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔

”رومی اور صائم میاں......“ میں نے بے ساختہ آگے بڑھ کر دونوں کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا تھا اور اب بھی ہمارے بچوں تانیا اور ایان سے مل کر بے حد خوش دکھائی دے رہے تھے اور بچے حیرت سے کبھی ہمیں یوں سوالیہ نگاہوں سے دیکھنے لگتے جیسے پوچھ رہے ہوں کہ یہ اتنے سارے ہمیں پیار دینے والے لوگ پہلے کہاں تھے؟

یونہی چند لمحوں تک سبھی سے مل کر ہم ابا کے کمرے کی طرف بڑھے‘ کمرے میں پہنچتے ہی چچا مرزا نے رقت آمیز جذبات سے ابا کو پکارا۔

”اٹھ جا خورشید عالم! دیکھ تیرا بیٹا‘ بہو بچے سارے تجھ سے ملنے آئے ہیں۔“ میں اور یومنہ ابا کے سرہانے کھڑے ہو گئے وہ گہری نیند میں لگ رہے تھے۔ ابا کے پاس موجود نرس نے بتایا کہ چند لمحوں پہلے ہی اس نے ابا کو بے ہوشی کا انجکشن دیا تھا تا کہ وہ کچھ دیر تک آرام کر سکیں۔ انہیں ایسی حالت میں دیکھ کر میں اور یومنہ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ پائے تھے۔ میں ابا سے ذرا قریب ہوا اور دھیرے سے انہیں پکارنے لگا۔

”دیکھو ابا آپ سے ملنے کون آیا ہے؟ تانیا بیٹا‘ ایان ادھر آؤ دیکھو یہ تمہارے دادا جان ہیں۔ ابا...... اٹھیے تانیا اور ایان آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ ایسا دیکھ کر مصطفیٰ عالم میرے قریب آئے اور مجھے تسلی دینے لگے۔

بھابی‘ بچوں اور یومنہ کو لے کر کمرے سے چلی گئیں جب یومنہ کے کمرے سے نکلنے سے پہلے میں نے اسے وہی کالی چادر لانے کو کہا جو بابا رب نواز کی نشانی تھی۔ کمرے سے جانے کے چند لمحوں بعد ہی یومنہ نے وہ چادر بابا عبدالقادر کے ہاتھ بھجوا دی تھی۔ ان کے ہاتھ سے چادر لیتے ہوئے میں نے دیکھا ان کے ہاتھوں میں رعشہ طاری تھا وہ بے حد کمزور ہو چکے تھے۔ میں نے ان سے ابا کی صحت کے لیے دعا کرنے کو کہا اور وہ ڈھیروں دعائیں کرتے کمرے سے چلے گئے۔

بابا عبدالقادر کے کمرے سے نکلتے ہی میں نے ہاتھ میں موجود چادر ابا پر پھیلا دی اور خود جائے نماز بچھا کر ابا کی صحت اور درازیٔ عمری کے لیے دعائیں کرنے لگا ابا کو کوئی جسمانی بیماری نہ تھی۔ وہ ڈپریشن کا شکار تھے۔

ماں بتاتی ہے کہ ایک روز وہ رات کے کسی پہر خود ہی اٹھ کر چلانے لگے تھے کہ ان پر کسی نے گولی چلائی ہے اس رات انہوں نے کوئی خوفناک خواب دیکھا تھا۔ بس اسی خواب نے انہیں بستر سے جا لگایا تھا وہ بستر پر پڑے خود ہی اعتراف کرنے لگے تھے کہ انہوں نے طہٰ اپنے بیٹے پر بڑا ستم ڈھایا‘ لوگوں کے ساتھ بڑی بڑی ناانصافیاں کیں نہ جانے وہ کیا کیا بولتے رہتے تھے۔ میں آج اپنے انہی ابا کی صحت اور درازیٔ عمری کے لیے روتے گڑگڑاتے رب سوہنے کے حضور دعائیں کر رہا تھا۔ کوئی گھڑی قبولیت کی گھڑی ثابت ہوتی ہے۔ اللہ نے میری اس گھڑی مانگی دعائیں سن لی تھیں۔ میں نے ابا کی آواز سن کر ایک طویل سجدے سے اپنے سر کو اٹھایا وہ مجھے ہی پکار رہے تھے۔ میں سرعت سے اٹھ کر ان کی قریب جا پہنچا۔

”طہٰ بیٹا! تم آ گئے میں نے تمہارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ بیٹا میں نے تمہاری بات سن کر اسے سمجھنے کی بجائے سارا زور تمہیں غلط ثابت کرنے پر لگا دیا جیسے میں سوچتا تھا کہ میری اپنی ہی اولاد آج مجھے سمجھانے چلی ہے کہ کیا غلط ہے اور کیا صحیح۔ یہ حق تو

صرف ماں باپ کے پاس ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو سمجھائیں لیکن میں غلط تھا بیٹا! تمہاری ہر بات درست تھی۔" میں خاموشی سے ابا کی باتوں کو سنتا رہا اور پھر جو وہ خاموش ہوئے تو اب میری باری تھی۔

"ابا...... وہ رب العزت ہمیں کئی طرح سے آزماتا ہے ہم پر آن پڑی آزمائش بھی اس کی رحمت کی ایک کڑی ہوتی ہے۔ دنیا کے گورکھ دھندوں میں پھنسے ہم جو اسے بھلا بیٹھے ہیں تو خود پر آن پڑی مصیبت پر کیسے بلبلا اٹھتے ہیں تب جو ہمیں اس مصیبت سے نجات کی کوئی راہ دکھائی نہیں پڑتی تو فقط ایک ہی ذات ہوتی ہے جو ان دشوار گزار راہوں میں ہمارا سہارا بنتی ہے۔ ہم جو پھر دنیا جہاں کو بھلا کر اس سے اپنی لو لگاتے ہیں تو اس کی رحمت آسمانی بجلی سے بھی کئی ہزار گنا تیزی سے ہماری جانب بڑھتی ہے۔ ابا اللہ سے لو لگا لو اسی میں نجات ہے۔" میں اتنا کہہ کر خاموش ہو چکا تھا۔

کمرے میں مہیب سناٹا چھایا ہوا تھا جب ایک دم سے ابا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور میں بھی انہیں چپ کراتے ہوئے ان کے ہاتھوں کو تھامے روتا رہا پھر میں انہیں آرام کرنے کو کہتا رہا لیکن وہ یومنہ اور بچوں سے ملنے کے لیے بضد تھے میں کچھ دیر تک یومنہ اور بچوں کو ان کے پاس لے آیا اور برسوں بعد وہ یومنہ اور بچوں کو دیکھ کر ایک بار پھر سے آبدیدہ ہو گئے تھے۔

اگلے چند روز میں ابا کی طبیعت میں تیزی سے بہتری آ رہی تھی میں اور یومنہ ہمہ وقت ان کی تیمارداری کے لیے موجود رہتے تھے دن کے کسی حصے میں ہم تانیا اور ایان کو بھی ان کے پاس لے آتے تھے۔ یوں بچوں کے ساتھ ان کا دل بہل جاتا تھا پھر میرے ساتھ تو وہ اپنے دل کا بوجھ اتارتے ہی رہتے تھے۔ چند ہی روز میں وہ خود چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے تھے پھر ایک روز جو میں نے عصر کی باجماعت نماز میں سلام پھیرا تو میرے عقب میں ہی ابا بھی نماز کی ادائیگی کے لیے وہاں موجود تھے یہ دیکھ کر میں نے اپنے رب سوہنے کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ ان کا دل بھی مسجد میں لگنے لگا تھا پھر دیکھتے ہی دیکھتے ابا پانچوں وقت کے نمازی پرہیزگار بن گئے۔

لیکن جیسے چند ہی روز میں ان کی طبیعت میں ایسی تبدیلی رونما ہوئی تھی ویسے ہی دھیرے دھیرے جب ان کی طبیعت بالکل سنبھل گئی تو پھر سے پہلی سی مصروفیت ان کے گرد رہنے لگی ایک ڈیڑھ ماہ بعد میں نے محسوس کیا کہ وہ پھر سے واپس اسی ڈگر پر لوٹ آئے تھے۔

یومنہ اور بچے جب سے یہاں آئے تھے وہ بھی بے حد خوش تھے میں جانے بوجھے ان سے جو محلہ مومن پورہ واپسی کی بات کرتا تو ان کا پرزور احتجاج دیکھنے کو ملتا تھا۔ ایک روز میں نے یومنہ اور اسے بچوں کو تیار کرنے کو کہا وہ مجھ سے دریافت کرنے کی کوشش کرتی رہی کہ میں انہیں کہاں لے جانا چاہتا ہوں لیکن میں نے ان سے یہ بات چھپائے رکھی۔ یومنہ اور بچے میرے ساتھ گاڑی میں بیٹھے تو میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ راستہ بھر بچے بھی مجھ سے دریافت کرتے رہے کہ "پپا ہم کہاں جا رہے ہیں؟" لیکن بچوں سے بھی میں نے یہ بات چھپائے رکھی۔ میں مضطرب گم صم سا تھا اور گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے چاہتا تھا کہ اس لمحے کوئی مجھ سے کسی قسم کا سوال جواب نہ کرے۔

شہر کی بارونق شاہراہ پر گاڑی دوڑاتے ہوئے مجھے ایک ڈیڑھ گھنٹہ ہو رہا تھا جب میں نے گاڑی شہر کے بڑے جیل خانہ سے باہر روک دی۔ گاڑی سے اترتے ہوئے یومنہ نے جیل کے بڑے سے بیرونی دروازے کی جانب دیکھا حیرانی اور تجسس سے پھر وہ مجھے دیکھتی

رہی لیکن اس نے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ میں چپ چاپ یومنہ اور بچوں کو لے کر جیل میں داخل ہوا اور انہیں لے کر اس کمرے میں جا پہنچا جہاں لوگ قیدیوں سے ملاقات کرتے تھے۔ وہاں مہیب سناٹے اور عالم اداسی میں بیٹھے ہمیں فقط چند لمحے ہی بیتے تھے کہ ہمارے سامنے خالی پڑے سلاخوں والے کمرے کا اندرونی دروازہ کھلنے کی کرب ناک آواز گونجی۔ یہ آواز سنتے ہی مجھ سمیت یومنہ اور بچے بھی یوں اچھل کر اپنی نشست سے اٹھ کھڑے ہوئے جب عبیرہ قیدیوں کی وردی میں ملبوس ہماری جانب بڑھی۔

"عبیرہ دیکھو آج میں تم سے کیا اپنا عہد پورا کیا یہ یومنہ ہے اور ان سے ملو یہ ہمارے بچے تانیا اور ایان ہیں۔ تانیا بیٹا یہ تمہاری عبیرہ آنٹی ہیں۔"

"لیکن طٰہٰ! عبیرہ یہاں کیسے......؟" یومنہ نے یوں حیرت سے میرا اور عبیرہ کا منہ تکتے ہوئے کہا لیکن یہ لمبی کہانی تھی میں فی الفور اس کے اس سوال کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ عبیرہ نے ہاتھ بڑھا کر یومنہ سے مصافحہ کیا عبیرہ کا بس نہیں چلا کہ وہ آہنی سلاخوں کو توڑ کر یومنہ کے قریب کھڑے بچوں کو اپنے سینے سے لگا لیتی۔ وہ بچوں کے ہاتھوں کو تھامے آبدیدہ لگ رہی تھی۔

کوئی چند گھڑیاں ہی ہمیں یوں عبیرہ سے ملنے کو ملیں جب مجھے آواز سنائی دی کہ ملاقات کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ نا چاہتے بھی ہمیں عبیرہ کو وہیں جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے چھوڑ کر باہر آنا پڑا۔ ہم لوگ جیل سے نکلے، گاڑی میں بیٹھے اور میں نے گاڑی واپس گھر کی جانب بڑھا دی۔ میری طرح یومنہ بھی چپ چاپ بیٹھی تھی لیکن تانیا بول رہی تھی۔

"پاپا! آنٹی جیل میں کیوں بند ہیں، وہ ہمارے ساتھ کیوں نہیں آئیں۔ پاپا لوگوں کو جیل میں کیوں بند کرتے ہیں؟"

"محبت کیا ہے؟"

محبت کیا ہے؟ محبت ایک انوکھا جذبہ اور دلفریب احساس ہے۔

☯ محبت اگر "لڑکا یا لڑکی" سے ہو جائے تو لیلیٰ مجنوں بن جائے۔

☯ اگر "شوہر" سے ہو جائے سجدے کا رتبہ بن جائے۔

☯ اگر "بیوی" سے ہو جائے تو شوہر کے لئے راحت و وفا بن جائے۔

☯ اگر "بہن" سے ہو جائے تو حیا کی چادر بن جائے۔

☯ "بھائی" سے ہو جائے تو اخوت کی دیوار بن جائے۔

☯ "ماں" سے ہو جائے تو جنت کی ہوا بن جائے۔

☯ "باپ" سے ہو جائے تو بازوؤں کی طاقت بن جائے۔

☯ محبت اگر ہمارے "پیارے آقا سرکار مدینہ رحمتہ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم" سے ہو جائے تو دنیا و آخرت سنور جائے۔

☯ اور اگر یہی محبت "خدا تعالیٰ" سے ہو جائے تو ساری محبتیں اس میں سما جائیں۔

فوزیہ سحر کائنات، کراچی

"تانیا چپ ہو جاؤ۔" یومنہ نے غصے سے کہا تو تانیا خاموش ہو گئی۔

"تانیا بیٹا! آپ ابھی بہت چھوٹی ہو، آپ کو یہ باتیں سمجھ نہیں آئیں گی۔" میں نے یومنہ کو تانیا کو ڈانٹتے سنا تو اسے سمجھایا یوں گھر پہنچنے تک باقی کا سارا راستہ سب خاموش رہے۔

گھر اپنے کمرے میں پہنچ کر یومنہ نے تانیا اور ایان کو باہر کھیلنے کو بھیج دیا اور وہ مجھ سے تھوڑا قریب آ بیٹھی۔

"طٰہ! میں یہاں تک تو جانتی ہوں کہ عبیرہ اور داؤد آپ کو بے یارومددگار چھوڑ کر فرار ہوگئے تھے پھر آپ نے عبیرہ سے ملنے کی کوشش بھی کی لیکن وہ آپ سے ملنا ہی نہ چاہتی تھی۔ عبیرہ اور داؤد ایک دوسرے کے بے حد قریب آچکے تھے۔ ایسے میں عبیرہ سے ایسا کیا فعل سرزد ہوا کہ اسے جیل جانا پڑا۔ طٰہ مجھے جاننا ہے آخر یہ کیا پہیلی ہے۔" یومنہ کا یہ سوال اور اس کا تجسس مجھے بھی اکسانے لگا تھا اور میرے ذہن میں عجب سی اتھل پتھل سی ہونے لگی تھی۔ میں یومنہ کو عبیرہ کی زندگی کے اس باب سے آگاہ کرنے کے لیے وہ کڑی ڈھونڈ رہا تھا جہاں سے میں عبیرہ کی ادھوری کہانی بیان کرسکوں ایسا سوچتے ہوئے میں نے جیسے ہی اپنے ذہن پر زور ڈالا میرے ذہن کی سلولائیڈ پر برسوں پہلے کے مناظر پھر سے ابھرنے لگے تھے۔

اس روز گھر پر ہی موجود تھا جب بابا عبدالقادر میرے پاس ایک بند لفافہ لے کر آئے وہ ابھی ابھی ڈاکیا میرے نام دے کر گیا تھا۔ لفافے کی پشت پر بھیجنے والے کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔ بابا عبدالقادر کے جانے کے بعد میں نے اس بند لفافے کو کھولا اس میں سے ایک ڈائری برآمد ہوئی۔ میں نے جھٹ سے ڈائری کو کھولا اس کے پہلے صفحے پر ہی ایک عبارت درج تھی۔

"میں تمہاری گناہ گار ہوں طٰہ! ہوسکے تو مجھے معاف کردینا عبیرہ!" میں نے سرعت سے ڈائری کا اگلا صفحہ کھولا۔ جس کے اگلے صفحے پر درج تھا طٰہ جب آپ یہ ڈائری پڑھ رہے ہوں میں اس دنیا کو چھوڑ کر آپ سے بہت دور جاچکی ہوں گی، میں نے اقبال جرم تو کیا تھا لیکن یہ میری سب سے بڑی غلطی تھی۔ میں جیل کی ان سلاخوں کے پیچھے بند اپنی زندگی کے سولہ سال قید بامشقت نہیں گزار سکتی۔ اسی لیے میں اپنی زندگی کا خاتمہ ہی کرنے جارہی ہوں۔" اتنا پڑھتے ہی میں نے تیزی سے ڈائری کے اگلے صفحات پلٹنا شروع کیے اور میں بنا رکے پڑھتا چلا گیا۔

"داؤد ہمیں طٰہ کو یوں بے یارومددگار چھوڑ کر نہیں چلے آنا چاہیے تھا، تم واپس پلٹ سکتے تھے اسے اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے۔"

"تمہیں کہا نا عبیرہ! میں اس موضوع پر مزید کچھ نہیں سننا چاہتا جیسے تم طٰہ کے گولی چلانے پر خوف زدہ ہوگئی تھی یونہی میں بھی ڈر گیا تھا اور پھر اچھا ہی ہوا نا اسے ساتھ لیتے تو ہم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاتے۔ یونہی خوامخواہ میں بدنامی سر لینا پڑتی۔ چلو میں تمہیں کسینو لے کر چلتا ہوں آج بہت سامال بنائیں گے اور پھر ہنی مون کے لیے سنگاپور چلیں گے۔" داؤد نے عبیرہ کو ساتھ لیا اور وہ کسینو جا پہنچا اس کا کسینو جانا اس کا بدترین دن ثابت ہوا وہ شراب بھی پیتا رہا اور پیسہ بھی ہارتا رہا۔ جب اس کی جیب خالی ہوگئی تو وہ اپنی ہار برداشت نہ کرسکا لیکن اب وہ سوچنے لگا کہ وہ ایسا کیا کرسکتا ہے کہ کسی طرح سے اسے اپنا پیسہ واپس مل جائے اس نے پاس کھڑی عبیرہ کی جانب دیکھا اور پھر اس کا بازو تھام لیا اور بازو کو اوپر کرتے ہوئے اس نے عبیرہ کی بازی لگادی۔ عبیرہ نے سنا کوئی دس ہزار کی آواز لگا رہا تھا، کسی نے بیس ہزار کی آواز لگائی تو کوئی ذرا پاس آکر اس کے گرد گھوم کر پچاس ہزار باآواز بلند پکار رہا تھا۔

اسے داؤد سے ایسی کسی بے ہودہ حرکت کی توقع نہ تھی وہ ایسی گری ہوئی حرکت بھی کرسکتا تھا اس نے غضب ناک ہوکر داؤد کو پکارا۔

"داؤد چھوڑو میرا بازو......" لیکن داؤد نے اس زور سے اس کی کلائی کو تھام رکھا تھا کہ داؤد کے ہاتھ کی انگلیاں اسے اپنے نرم و نازک بازو میں پیوست ہوتی محسوس ہورہی تھیں۔ اس نے اگلے ہی پل اس زور

سے طمانچہ داؤد کے چہرے پر رسید کیا کہ وہ ہل کے رہ گیا عبیرہ کے طمانچہ کی ایسی گونج تھی کہ کسینو میں چل رہے میوزک کے سوا سبھی لوگ اپنی جگہ جامد و ساکت ہو کر رہ گئے۔

داؤد نے عبیرہ کا بازو چھوڑا وہ اپنے پیروں پر لڑکھڑا سا گیا تھا۔ نشے میں دھت اس نے ایک ہاتھ سے اپنے سر کو ذرا سا تھامنے کی کوشش کی جب اس نے دوبارہ سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے سامنے دیکھا تو عبیرہ وہاں سے جا چکی تھی۔ اس روز گھر پہنچ کر عبیرہ ساری رات روتی رہی اسے اندازہ نہیں تھا کہ وہ داؤد جس کی خاطر اس نے طٰہٰ کو چھوڑ دیا تھا وہ ایسی بے ہودہ حرکت بھی کر سکتا تھا۔ اگلے روز جب وہ اپنے کمرے میں ہی پڑی تھی۔ اس کے کمرے کا دروازہ یوں تیزی سے کھلا اور داؤد غضب ناک حالت میں کمرے میں داخل ہوا اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی پلٹ کر دروازہ لاک کر دیا اور پھر اس سے پہلے کہ عبیرہ اپنے بستر سے اٹھتی اس نے وہیں بستر پر پہنچ کر عبیرہ کو بالوں سے دبوچ لیا۔

"تمہاری یہ جرأت تم نے میرے دوستوں کے سامنے مجھے تھپڑ دے مارا۔" ایسا کہتے ہوئے اس نے زوردار تھپڑ عبیرہ کو رسید کیا کہ وہ بستر پر جا گری۔ داؤد نے اسے پھر سے بالوں سے دبوچ لیا۔ "تم کیا سمجھتی ہو میں تم سے پیار کرتا ہوں، میں تیری جیسی کم ذات سے شادی کروں گا۔ میرا مقصد تو صرف تمہیں طٰہٰ سے دور کرنا تھا اور اس رات طٰہٰ کے ہاتھوں ہونے والے قتل نے میرا کام اور بھی آسان کر دیا تھا اور اب تمہارا طٰہٰ تو گیا......"

داؤد آخری بات کہتے ہوئے زور زور سے قہقہے لگانے لگا جیسے وہ پاگل ہو چکا تھا۔ ایک دم وہ پھر سے بولا۔

"اب اگر تمہیں میری ہو کے رہنا ہے تو صرف ایک ہی راستہ ہے کہ میری رکھیل بن کر رہو۔ اب طٰہٰ تو

گوہر آب دار!

♥۔ بلند کردار کی دیوار کی تسخیر ناممکن ہے جبکہ لوہے کی دیوار گرائی جا سکتی ہے۔

♥۔ ایسا کام جس سے کسی کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل جائے خدا کے نزدیک نیک اور پسندیدہ ہے۔

♥۔ انسان کو دو چیزیں متحرک کرتی ہیں ایک شوق دوسرا خوف۔

♥۔ مبارک ہیں وہ لوگ جن کے پاس نصیحت کرنے کے لئے الفاظ نہیں اعمال ہیں۔

♥۔ شام زندگی کی ہو یا دکھوں کی بالآخر ڈھل ہی جاتی ہے۔

♥۔ مصیبت کے وقت گھبرانے والے لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ستارے بھی تو اندھیرے میں چمکتے ہیں۔

اے انجم، چناب نگر

تمہیں قبول کرے گا نہیں۔" داؤد کے منہ سے سچ سن کر عبیرہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا اور وہ زارو قطار روئے جا رہی تھی۔ داؤد نے اس کے قریب ہی کھڑے ہو کر دو ایک اور دھمکیاں دیں اور جیسے ہی وہ کمرے سے باہر نکلنے کے لیے پلٹا تو اسے اپنے عقب سے عبیرہ کی آواز سنائی دی۔

"رک جاؤ داؤد......" داؤد عبیرہ کی آواز سن کر پلٹا اور پھر جیسے اس کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی عبیرہ اس پر ریوالور تانے کھڑی تھی۔

"نن...... نن...... نیچے رکھ دو اسے عبیرہ!" عبیرہ یہ سن کر چلائی۔

"وہیں رک جاؤ داؤد......" داؤد جو ایک قدم آگے بڑھا تھا عبیرہ کے ہاتھ کی انگلیوں کو ریوالور کے ٹریگر پر پیوست دیکھ کر وہیں رک گیا۔

"مجھے غم اس بات کا نہیں کہ تم نے مجھے دغا کیوں

دیا؟ غم تو اس بات کا ہے کہ میں نے تمہاری وجہ سے طٰہٰ کو کھو دیا۔ جب اسے میری ضرورت تھی تب میں اسے تمہاری خاطر دھتکارتی رہی۔ تم نے ہی مجھ سے کہا تھا ناں کہ تم مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہو' میرے بغیر تم زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ تمہاری ایسی باتیں سن کر میں سوچتی تھی کہ اگر کوئی مجھ سے کہے کہ میں طٰہٰ کے بغیر رہ سکتی ہوں تو میرے لیے ایسا ناممکن تھا۔ میں طٰہٰ کے بغیر جینے کا تصور بھی نہ کر سکتی تھی لیکن پھر میں تمہیں بھی مرتا نہ دیکھ سکتی تھی۔ میں نے سوچا طٰہٰ کی زندگی میں تو راحت کی محبت بھی تھی لیکن اگر میں نے تمہیں انکار کر دیا تو کہیں تم ایسا ویسا قدم نہ اٹھا لو...... صرف تمہاری خاطر میں طٰہٰ کو خود سے دور کرنے کے لیے کیا کیا جتن کرتی رہی' اسے نظر انداز کرتی رہی وہ میرے گھر مجھ سے ملنے آتا تو میں ملازم سے کہہ دیتی کہ وہ طٰہٰ سے کہہ دیا کرے کہ میں گھر پر نہیں ہوں لیکن میں جانتی تھی کہ آخر ایسا کب تک چلے گا۔ ایک روز وہ جان جائے گا کہ میں گھر پر ہی ہوں اور ملازم میرے کہنے پر ہی اس سے جھوٹ بولتا رہا ہے پھر ایک روز وہ میرے کمرے تک آن پہنچا میں نے یونہی فون کان سے لگایا اور با آواز بلند ایسا ظاہر کرتی رہی جیسے میں داؤد تم سے باتیں کر رہی تھی کہ طٰہٰ کو مجھ سے نفرت ہو جائے وہ میری طرف سے بددل ہو جائے' مجھے بے وفا سمجھ کر بھول جائے۔ اس رات میں ایسا کرنے کے بعد دیر تک خود بھی روتی رہی تھی میں جانتی تھی کہ طٰہٰ بھی میری باتیں سن کر دوسری طرف بیٹھا آنسو بہا رہا ہوگا۔ میری باتیں اس کے دل پر زہر میں بجھے ہوئے تیر کی طرح چلی ہوں گی میں ایسا صرف اس لیے کرتی رہی داؤد کہ کہیں تمہارا دل نہ ٹوٹے' کہیں تم اپنی محبت کو کھو دینے کے غم سے اپنی زندگی نہ کھو دو اور تم نے کیا کیا......؟ اتنا بڑا دھوکا دیا مجھے...... تم مجھے اپنی رکھیل کیا بناؤ گے میں تمہارا نام و نشان مٹا دوں گی...... داؤد......" آخری بات کہنے تک عبیرہ پسینے سے شرابور ہو گئی تھی اس کی نگاہوں سے بدلے کی آگ برس رہی تھی۔

"رک جاؤ عبیرہ...... رک جاؤ......" داؤد کے منہ سے یہ الفاظ دوبارہ ادا ہوئے اور ڈز کی آواز کے ساتھ ہی تیسری بار الفاظ جیسے اس کے حلق میں ہی اٹک گئے تھے۔

عبیرہ کی ڈائری میں اس کی زندگی کی اس حقیقت کو جان کر مجھے اس سے ہمدردی ہونے لگی تھی۔ داؤد نے واقعی اس کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی کی تھی جس کی سزا اس نے خود اسے اپنے ہاتھوں سے دے ڈالی تھی لیکن اب وہ خود کے ساتھ بہت بڑا ظلم کرنے جا رہی تھی۔

جیل پہنچ کر مجھے معلوم پڑا کہ عبیرہ نے واقعی خودکشی کی کوشش کی تھی لیکن اسے بچا لیا گیا تھا۔ وہ ایک سرکاری اسپتال میں ایڈمٹ تھی میں وہاں پہنچا تو مجھے دیکھتے ہی اس نے اپنا چہرہ چھپا لیا۔

میں اس کے قریب جا بیٹھا اور سوچتا رہا کہ میں اسے کیا کہوں وہ جو ٹوٹ چکی تھی' ریزہ ریزہ ہو رہی تھی۔ اب زندہ ہی نہ رہنا چاہتی تھی میں اسے کن لفظوں میں دلاسہ دوں پھر نہ جانے کیسے میرے لب ہلے اور میں بولتا رہا۔

"عبیرہ تم صحیح تھیں...... تم نے وہی کیا جو تمہیں صحیح لگتا تھا۔ تم نے داؤد کو سزا دی کیوں کہ وہ ایسی ہی سزا کا حق دار تھا لیکن تم تو بے گناہ تھیں پھر خود کو کیوں بار بار سزا دینے پر اتر آئی ہو۔ قانون کی نظر میں اگر تم قصوروار ہو تو سولہ سال قید بامشقت بھی تو کاٹ چکی ہو۔ یہ سولہ دن بھی گزرے سالوں کی طرح تیزی سے بیت جائیں گے پھر ایک نئی صبح ہوگی۔ تم اپنی زندگی ایک نئے سرے سے شروع کرنا' تم ایسا کرو گی ناں

عبیرہ......؟" میری باتیں سن کر اس کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ وہ مسلسل خاموش تھی لیکن اس کے بہتے اشک بتاتے تھے کہ میری باتوں کا اس کے دل پر گہرا اثر ہوا تھا میں بھی تو اسے چاہتا تھا۔ اسے ایسی اذیت وہ حالت میں دیکھ کر میرا دل بھی بھر آیا۔

"محبت تو سہارا ہوتی ہے عبیرہ! اگر تم نے کبھی واقعی مجھ سے محبت کی تھی تو تمہیں اس محبت کا واسطہ آئندہ کبھی اپنی زندگی کو ختم کرنے کی کوشش نہ کرنا۔" میں اتنا کہہ کر اس روز لوٹ آیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ عبیرہ اب دوبارہ ایسی احمقانہ حرکت نہ کرے گی اور اس نے میری ایسی امید کو پھر ٹوٹنے نہ دیا تھا۔

یومنہ کو عبیرہ کی دکھوں سے عبارت کہانی سن کر بہت دکھ ہوا اور وہ مجھ سے کہنے لگی۔

"طٰہٰ......ہم لوگ جب اپنوں سے جدا ہوئے تو ان سے دوری کتنا بڑا صدمہ تھی' عبیرہ کو تو اس کے گھر والے رشتہ دار دوست احباب بھی چھوڑ چکے ہیں۔ جب آج سے بیس روز بعد اس کی سزا پوری ہوگی تو اسے جیل سے باہر کوئی نہیں لینے آئے گا وہ جیل کی تاریکیوں سے باہر آئے گی تو وہ لمحہ اس کے لیے جیل میں مقید سولہ سالوں سے بھی بھاری ہوگا۔ طٰہٰ! ہم عبیرہ کو گھر لے آئیں گے۔ اسے اس سنگدل دنیا میں بے یار و مددگار نہیں چھوڑیں گے۔" یومنہ صحیح کہہ رہی تھی میں بھی ایسی ہی کشمکش کا شکار ہو رہا تھا جب اس نے عبیرہ کو گھر لے آنے کی بات کہہ کر میری پریشانی دور کردی تھی یوں میں نے عبیرہ کو گھر لے آنے کی حامی بھرلی تھی۔

ایک روز بابا عبدالقادر میرے پاس آئے اور بولے کہ بڑے صاحب آپ کو یاد فرما رہے ہیں۔ بابا عبدالقادر میرے ابا کا یہ پیغام دے کر باہر کی جانب نکلے تو میں ان کے تعاقب میں باہر لان میں پہنچا وہ لان میں اسی جگہ بیٹھے تھے جہاں برسوں پہلے بیٹھے ہوئے ابا کی

"بے کار ہے"

☆۔ بے کار ہے وہ آنسو جس میں اثر نہ ہو۔
☆۔ بے کار ہے وہ پردہ جس میں حیا نہ ہو۔
☆۔ بے کار ہے وہ قلم جس میں سچائی نہ ہو۔
☆۔ بے کار ہے وہ دوست جو مخلص نہ ہو۔
☆۔ بے کار ہے وہ دل جس میں محبت نہ ہو۔
☆۔ بے کار ہے وہ پھل جس میں خوشبو نہ ہو۔
☆۔ بے کار ہے وہ دل جس میں درد نہ ہو۔
☆۔ بے کار ہے وہ دل جس میں چاہت نہ ہو۔
☆۔ بے کار ہے وہ انسان جس میں انسانیت نہ ہو۔

شکیلہ انجم' پنڈی بھٹیاں

پُرخار باتیں سن کر میں نے دلبرداشتہ ہو کر گھر چھوڑا تھا۔ وہ میرے وہاں پہنچتے ہی مجھے خوش دلی سے ملے اور بتانے لگے۔

"طٰہٰ! میں نے گزرے چند روز میں بہت سے کام نمٹا لیے ہیں۔ اپنے اندرون و بیرون ملک موجود اثاثے اور ان کی تفصیلات جمع کرنے کے بعد میں نے دو ارب روپیہ الگ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ میں پہلے خود عملی کا مظاہرہ کروں گا اور پھر اپنے اردگرد بستے میرے ہی جیسوں سے بھی درخواست کروں گا کہ وہ اپنے وطن کا لوٹا ہوا مال اسے واپس لوٹا دیں۔" ابا کی باتیں سن کر مجھے یقین ہی نہ آرہا تھا کہ میرے سامنے بیٹھا شخص سابقہ ایم این اے خورشید عالم ہی تھا۔ جسے دولت اپنی اولاد سے زیادہ عزیز تھی جس نے ایک بار اسی دولت کی چاہ میں مجھے گھر سے نکال دیا تھا اور وہ اب اپنے اثاثوں سے دستبردار ہونا چاہتے تھے وہ پچھلے دنوں اسی لیے اتنا مصروف رہے تھے اور میں کتنا غلط تھا جو یہی سوچتا رہا کہ وہ چند دن نمازی پرہیزگار بن کر پھر سے اپنی ڈگر پر لوٹ چکے تھے۔ ایسا ہرگز نہ تھا بلکہ وہ تو نظام میں تبدیلی لانا چاہتے تھے۔ ایک نئے انقلاب کی

راہ ہموار کرنا چاہتے تھے پہلے خود عمل کر کے دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کرنا چاہتے تھے۔

اگلے کئی روز میں ابا کی مصروفیات کو دیکھتا رہا نہ جانے کہاں سے ان میں اس قدر ایمانداری کا جذبہ امڈ آیا تھا۔ وہ اپنے حلقے کے قریبی لوگوں میں بھی ایسے جذبے کو ابھارنے میں لگے رہتے تھے اور میں پھر بھلا کیسے پیچھے رہتا' میں بھی ان کے ہمراہ ان کی خدمت میں ہمہ وقت موجود رہتا تھا۔ اسی مصروفیت میں' میں یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ چند روز بعد ہی عبیرہ بھی جیل سے رہا ہونے والی تھی اور یہ یاد دہانی مجھے یومنہ نے کروائی تھی۔

اگلے روز نئی صبح ہم لوگ فجر کی نماز کے بعد سوئے نہ تھے بلکہ دیر تک عبیرہ کے لیے دعائیں کرتے رہے تھے وہ آج سولہ سال قید بامشقت کاٹ کر رہا ہونے جا رہی تھی۔ ایک طویل آزمائش کے سفر سے گزرنے کے بعد اس کی زندگی کا ایک نیا دن طلوع ہو رہا تھا۔ میں اور یومنہ اب اس گھڑی کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے جب عبیرہ جیل کی تاریکیوں سے نکل کر باہر آئے گی تو وہاں میں اور یومنہ کھڑے اسے خوش آمدید کہہ رہے ہوں گے۔ ایک بار پھر سے دنیا میں دوستی کا جذبہ سربلند ہو رہا ہوگا۔

دوستی اور وفا کے جذبے پھر سے مسکرانے لگیں گے یومنہ اور بچے بھی اس روز بہت خوش لگ رہے تھے۔ یومنہ اور بچوں نے مل کر عبیرہ کو خوش آمدید کہنے کے لیے اس کا کمرہ بھی سجا رکھا تھا۔ میں نے اس کمرے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو تانیا نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ یومنہ اسے ایسا کرتے دیکھ کر پاس کھڑی کھلکھلائے جا رہی تھی اور پھر میرا ایک ہاتھ تانیا نے اور دوسرا ایان نے تھاما اور وہ مجھے عبیرہ کے لیے سجائے کمرے کی طرف لے گئے۔ وہاں پہنچ کر بچوں نے جو میری آنکھوں سے پٹی ہٹائی تو کمرہ گلاب کے پھولوں اور کلیوں سے مہک رہا تھا۔ سامنے دیوار پر انگریزی کے بڑے حروف میں ویلکم سویٹ عبیرہ ستاروں سے جگمگا رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ تعریف کرتے ہوئے تانیا اور ایان کو اپنی بانہوں میں سمیٹ لیا اور اب بے حد مشکور کن نگاہوں سے یومنہ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اسے دعائیں دے رہا تھا جس نے زندگی میں میری ہر خوشی کا احترام کیا تھا پھر چند لمحوں بعد ہی یومنہ اور بچوں کو لے کر گھر سے نکلا تو راستے میں ایک جگہ رک کر میں نے پھولوں کے بوکے لیے اور پھر جو وہاں سے چلا تو گاڑی جیل خانہ کے باہر پہنچ کر ہی رکی۔

گاڑی سے اترتے ہی یومنہ نے پھولوں کے بوکے تانیا اور ایان کو دیئے اور اب ہم عبیرہ کے جیل سے برآمد ہونے کا بے تابی سے انتظار کرنے لگے۔ جیل خانہ کے بڑے سے آہنی دروازے کا چھوٹا پٹ کھلا تو کالا عبایا پہنے ایک خاتون باہر آئی ایک لمحہ کو میں اور یومنہ پہچان ہی نہ سکے کہ وہ عبیرہ تھی۔ ہم ششدر حیران وہیں کھڑے تھے جب وہ ہاتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ تھامے ہماری طرف ہی بڑھتی چلی آ رہی تھی۔